خلشِ بے نام سی

(افسانے)

صادقہ نواب سحر

خلشِ بے نام سی

(افسانے)

صادقہ نواب سحرؔ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

KHALISH BE NAAM SI

(Short Stories)

by

Sadiqua Nawab Saher

Flat No.2, 1st. Floor, Mohsin Manzil
Shastri Nagar, Khopoli. 410203
Dist: Raigad (Maharashtra.)
E-mail:Sadiquanawabsaher@hotmail.com
Mobile: 09370821955, 09422493868

Year of Ist Edition 2013
Year of IInd Edition 2014
ISBN 978-93-5073-188-8
₹ 150/-

نام کتاب	:	خلش بے نام سی (افسانے)
مصنفہ	:	صادقہ نواب سحر
سنہ اشاعت اوّل	:	۲۰۱۳ء
سنہ اشاعت دوم	:	۲۰۱۴ء
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

☆	پیش لفظ	5
1	شریاں والی	9
2	میٹر گرتا ہے!	22
3	شرارہ	27
4	خلش بے نام سی	32
5	سلگتی راکھ	42
6	اُدھڑا ہوا فراک	47
7	منّت	51
8	ٹی شرٹ	60
9	نوٹس	65
10	چاہے ان چاہے	74
11	ہزاروں خواہشیں ایسی......	88
12	''خدا کی دنیا بہت وسیع ہے''	94
13	پہلی بیوی	106
14	ایس ایم ایس	118
15	ابارشن	128
16	باڈی	133

☆☆

پیش لفظ

مصطفیٰ کریم

ہر فن کی طرح افسانے کی تخلیق بھی مشکل کام ہے۔ چند صفحات میں کسی کردار کو اس طرح نمایاں کرنا کہ وہ ہماری اس جبلت کو ظاہر کردے جس سے ہم ناواقف ہوتے ہیں یا جاننا بھی نہیں چاہتے، آسان نہیں۔ اسی طرح کسی ایک واقعے کو اس طرح اہم بنا کر پیش کرنا کہ ہم اسے ہمیشہ یاد رکھیں ایک مشکل کام ہے۔ افسانہ کیا ہے اور کس طرح فکشن کے دوسرے عناصر سے مختلف ہوتا ہے اس پر رائے مختلف ہوتی رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوگی۔ لیکن بہت سوچنے کے بعد چیخوف کی رائے درست محسوس ہوتی ہے۔ اس نے کہیں لکھا تھا:۔

Short story is a slice of life.

انگریزی ادب کے افسانہ نگاروں میں آئیرش افسانہ نگاروں کا بڑا نام ہے۔ ان میں سے کسی نے لکھا ہے:۔

A story is a way to say some thing that can't be said in any other way and it takes every word in the story what the meaning is.

ان نظریات کے علاوہ مختصر افسانوں کے مبصر یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ اب مختصر افسانے کو کسی ایک کردار یا کسی ایک واقعے یا کسی خاص احساس کا تابع ہونے کی ضرورت نہیں اور مختصر افسانہ ایک ناول کا بھی تاثر دے سکتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کے

افسانوں میں حساس قاری کو یہ ساری خوبیاں نظر آئیں گی۔

ہندی ادب میں کسی ایسی ادیبہ کا نامور ہونا جو اردو بولنے اور لکھنے والے گھر میں پیدا ہوئی اور پرورش پائی ایک ایسی بڑائی ہے، جس پر جتنا بھی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کارنامہ ہندوستان ہے' اسی ایک خوبی نے مجھے انکے فن کی جانب متوجہ کیا۔ پچھلی صدی میں ہندوستان کا ٹوٹنا اور بڑے پیمانے پر قتل وفساد جس نے تاریخ کو خونی تو کیا ہی ایک تہذیب کو بھی مٹانے کے راستے ہموار کر دیئے۔ لیکن بھلا ہو ہندوستان کی عظیم سیکولر روایت کا جس نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ یقیناً اس روایت کو ان ادیبوں نے بھی توانائی دی جنھوں نے اردو اور ہندی کو اپنی مادری زبان سمجھا اور انھیں باثروت بنایا۔ ان ادیبوں میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔ جنھوں نے ہندی ادب میں ڈاکٹریٹ کیا اور فکشن کے لیے اس زبان کو بھی چنا۔

ان کا ناول '' کہانی کوئی سناؤ متاشا'' عمدہ اور دلچسپ ہے۔ جس میں تانیثی کردار متاشا کے پس منظر میں وہ ستم اور جبر ہیں جو ایک عورت پر بار بار ٹوٹتے ہیں۔ اور عورت کو محض اپنے جنس کی وجہ سے انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے کے بعد یہی خیال آتا ہے کہ مصنفہ اپنے افسانوں میں بھی ان ہی مظالم کو پیش کریں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہے انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت سے دور ہو کر اپنی شناخت بنائی اور انفرادیت قائم کی ہے۔ دیگر فنون کی طرح ادیبوں کو بھی اپنی آواز پانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی آواز جس پر کسی دوسرے ادیب کا اثر نہیں محسوس ہوتا۔ ان کے افسانوں میں انسانیت کی روشنی بکھری ہوئی ہے۔ گو ان افسانوں میں کوئی پلاٹ نہیں محسوس ہوتا لیکن یہ سبھی زندگی کی ایک قاش ضرور لگتے ہیں۔ صادقہ نے اپنے افسانوں میں اردگرد چلتے پھرتے اور دکھ کے مارے انسانوں پر گہری نظر ڈال کر انھیں ہمارے سامنے اس طرح لا کھڑا کر دیا ہے کہ ان میں ہم اپنے آپ کو بھی دیکھتے ہیں۔

میں نے اوپر جس انسانیت کا ذکر کیا ہے اسے افسانے یا ناول میں دھیما رکھنا ضروری ہے۔ یعنی ادیب چیخ کر اس کی جانب متوجہ نہ کرے جبھی اس کا دل پر اثر گہرا ہوتا

ہے۔ افسانہ 'پہلی بیوی' میں ایک راہ چلتی تعلیم یافتہ عورت کی نگاہ جب اس ننھے سے بچے پر پڑتی ہے جس کے لئے اس کے غریب ماں باپ انکوبیٹر کی تلاش میں حیران و پریشان ہیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کر سکیں گے۔ عورت انھیں روک لیتی ہے اور بچے کے لیے اس کی مامتا اس طرح جاگتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے پرخلوص الفاظ بلکہ مالی طور پر بھی مدد کرنا چاہتی ہے۔ لیکن بچہ کے باپ کی مردانہ سائیکی سے عورت کی انسانیت کی ٹکر ہوتی ہے اور ایک المناک صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جو ہر روز ہی ہوتا رہتا ہے اور جسے مصنفہ نے فنکاری سے پیش کیا ہے۔

'چاہے ان چاہے' میں ادھیڑ عمر کا ریڈی اپنی بیوی اور بچوں سے دور ایک ریستورانت کھول کر اپنی روزی کمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نیک انسان ہے لیکن اس کے ریستورانت میں ایک جوان بیوہ خادمہ جب آجاتی ہے تو کوشش کے باوجود اس کی کشش سے خود کو دور نہیں رکھ سکتا۔ عورت کے دل میں بھی امنگ ہے لیکن دونوں ہی اپنے جذبات پر پردہ ڈالے رہتے ہیں، محض ہلکے اشاروں سے ان کی چاہت کا راز کھلتا ہے۔ یہی تہہ داری افسانے کی جان ہے اور عام افسانوں سے الگ بلند مقام حاصل کر لیتی ہے۔ اس کہانی میں دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس عورت کو ریڈی کی بیوی نے اس کے پاس بھیجا تھا۔ اس لیے بیوی کی بابت بھی چند دلچسپ سوالات قاری کے ذہن میں اٹھ سکتے ہیں' جن کی وجہ سے افسانے کا جمالیاتی رخ سامنے آتا ہے۔

افسانہ 'منت' کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس طرح افسانے میں تجسس کا عنصر ختم ہو جائے گا لیکن افسانے میں جو سماجی اقدار کا ٹکراؤ ہے اور مقامی تہذیب کی جو جھلکیاں ہیں وہ اس کہانی کو دلکش بناتی ہیں۔ افسانہ 'شریاں والی' میں انسانی رشتوں کے جو Dynamics ہیں وہ ہوا کے تیز جھونکوں کی طرح قاری کے گرد اڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ اسے پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کاش صادقہ نواب سحر اسے ناولا کی طرح تحریر کرتیں۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ یہ افسانہ مزید پھیلاؤ مصنف سے طلب کر رہا ہے۔

'ایس.ایم.ایس' نام کی کہانی ایک Thriller کی طرح تیز محسوس ہوتی ہے۔ گو محبت کا موضوع نیا نہیں لیکن اسے نیا بنا کر لکھا جا سکتا ہے اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں آج کی ٹکنالوجی کس طرح انسان کے جذبات سے کھیلنے کے مواقع دیتی ہے اور نئے رشتے کو جنم دیتی ہے وہ اسے ماڈرن بھی بناتی ہے۔ اردو اور ہندی ادب میں صادقہ یقیناً ایک اہم قلم کار بن چکی ہیں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہ آج جس مقام پر ہیں اس سے اور بھی آگے جائیں گی۔

۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء

5 Campion Close. Scalby. Scarborough. YO13 0QJ. Uk

The writer of this preface is author of two collections of short stories, two novellas and three novels.

His historical novel ' Toofan ki Ahat ' was considered in the review in AJKAL as ground breaking.

ثریاں والی

مانگتے کھاتے وہ ایک دن گنٹور سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کی دوری پر واقع شہر ورنگل پہنچی تو وہاں کے سب سے شاندار مکان کے سامنے کھڑی ایک بھاری بھرکم، کسے ہوئے بدن اور چوڑے چہرے والی گوری گوری اور اونچے قد کی، بجی دھجی، زیوروں سے پیلی ہو رہی عورت بہت مٹھاس سے چلائی۔

''ثریاں والی اماں!! تم یہاں؟''

اور وہ اپنی عمر کے ابتدائی دور میں پہنچ گئی......نو سال کی نصیبن کی شادی اس کے چالیس سال کے بہنوئی سے کروادی گئی تھی .... کیونکہ ان کی بیوی یعنی نصیبن کی سب سے بڑی بہن اپنے دونوں بچوں سمیت باری باری فلو کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور اس کی اپنے سے بڑی تینوں بہنوں کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ آندھرا پردیش کے ضلع گنٹور میں اپنے دو بچوں اور دھن دھان سے بھرے گھر کی مالکن کے روپ میں سونے میں چمکتی نصیبن شادیوں میں سات سہاگنوں کے ماتھے پر مس کر کے، دلہن کو ساس کے ذریعے منگل سوتر پہنائے جانے کی رسم میں سب سے آگے بلائی جاتی۔ مسلمانوں میں بھی منگل سوتر ضروری ہوتا۔

— ''ماشاءاللہ!''، اس کے نصیب پر لوگ کہتے۔

ہندوؤں ہی کی طرح مسلمانوں کے گھروں کی ساری شادی شدہ لڑکیاں، عورتیں ساڑیاں، پہنتی تھیں اور نصیبن کنواریوں کی طرح شلوار قمیص۔ اسی لیے نصیبن اب ''ثریاں

والی'' یعنی شلوار والی'' کہلاتی تھی۔اس کا اصلی نام لوگ بھول چکے تھے۔

جانے کس کی نظر لگ گئی کہ ایک دن اس کی بارہ سال کی بیٹی رات کو ایسے سوئی کہ صبح آنکھیں نہیں کھول پائی۔شوہر نے غم لے لیا اور کچھ دن بیمار رہ کر چل بسا۔

سال بھر بعد زندگی کا اکلوتا سہارا، بیٹا بھی تیز بخار میں دنیا سے سدھار گیا...... نصیبن بے سہارا رہ گئی۔

شوہر نے بے حد دولت چھوڑی تھی مگر اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہتے ہوئے وہ ڈرتی تھی۔آخر اس نے اپنے ایک رشتہ دار کے گھر کا آدھا حصہ خرید لیا اور بڑا مکان کرائے پر اٹھا کر اس ساجھے آنگن والے گھر میں اٹھ آئی۔

نئے گھر کے اس علاقے میں مجاوروں کے خاندان بستے تھے۔نصیبن کا یہ گھر کالے مستان کی درگاہ کے سامنے تھا۔یہ علاقہ مفتی اسٹریٹ کے پرانے محلے سے کچھ دوری پر واقع ہے۔نصیبن صبح شام درگاہ میں بیٹھ کر قرآن شریف پڑھ کر اپنا وقت گزارتی تھی۔اس اکیلے پن میں بھی گھر گرہستی چلانے میں اس نے کوئی کسر نہیں رکھی۔وہ اپنے لیے مزیدار اور چٹپٹے کھانے بناتی اور مزے لے کر کھاتی بھی...... وہیں درگاہ میں ایک مجاور نے اپنی بہن سے اسے پیغام بھجوایا۔مجاور کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔

کیا ضرورت ہے ری، تجھے مرَد کی؟ تیرا مرد اِتا چھوڑ کے تو مرا! کیا کرنے یہ سوب؟ لوگاں باتاں کرِ نگے نا!''

''کیسے جینا...... اکیلے کیسے جینا میں؟ اماں باوا بھی نئیں رہے نا!....میں کرلیتی۔''، نصیبن نے اپنی بہنوں سے کہا—اور چار لوگوں کی موجودگی میں اس کا نکاح مجاور سے ہو گیا۔وہ اس کے اس آدھے مکان میں رہنے کے لیے آ گیا۔

یہ نیا 'مرد' نصیبن کو ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔'حسن مجاور' کا اوپری ہونٹ کچھ اس طرح سے پھٹا ہوا تھا کہ دو دانت مسوڑھے سمیت ہمیشہ کھلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔وہ ہمیشہ منہ سے رستا ہوا لعاب رومال سے پونچھا کرتا—وہ سب تو ٹھیک، پہلے شوہر سے پائی ہوئی خوشیاں اور محبت اس کے ساتھ دل ملا پانے میں دونوں کے درمیان آتی رہیں۔

''نہیں جمتا...... خلع لے لی،'' نصیبن نے اپنی بہنوں کو جواب دیا۔ ایک مہینے بعد دن رات مستی میں پڑے ہوئے، گانجے میں دھت شوہر سے اس نے خلع لے لی۔

اس کے بعد نصیبن نے وہ گھر بھی کرائے پر اٹھا دیا اور کبھی اِدھر، کبھی ادھر پھرتی رہی۔ بہنوں کے گھر گئی تو کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی بہت سی چیزیں تحفتاً ساتھ لیتی گئی۔ کچھ دن اچھا لگا۔ پھر رشتوں میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ بہنوں کو برا نہ لگے اس لیے بہنوئیوں کے سامنے کم جاتی کہ اسے دیکھتے ہی وہ چھیڑ خانی شروع کر دیتے۔ اکیلے پن سے پریشان ہو کر اب اس نے رشتہ داروں کے گھر آنا جانا شروع کیا۔

ایک بار گنٹور ریلوے کوارٹرس میں وہ اپنی تایازاد بہن سے ملنے گئی۔ وہیں پڑوس میں ایک پریوار والا ریلوے ٹی سی مستان خان، مدراس سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ اس کے بہت سے بچے تھے۔ اسے جب نصیبن کے مالدار بیوہ ہونے کا پتہ چلا تو اس نے نکاح کی تجویز رکھی اور نصیبن نے اسے قبول بھی کر لیا۔ اب وہ اپنے پرانے مفتی محلے کے بڑے کویلو، یعنی کھپریل کے مکان میں رہنے لگی تھی۔ مستان خان دو دن ادھر، دو دن اُدھر گزارنے لگا۔

''میں تمہارے بیوی بچوں سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں دیکھیں گے۔'' وہ ٹال دیا کرتا۔

اس دن وہ اکیلی ہی ریلوے کوارٹر چلی گئی۔ یہ گھر اس کے گھر سے تقریباً آدھے گھنٹے کی دوری پر تھا۔

''پھر نہیں آنا کبھی ادھر، ہاں......''، سوکن اور بچوں نے اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ دراصل اس بار نصیبن کے شادی کے ارادے میں ایک بھرے پُرے خاندان میں گھل مل کر رہنے کی خواہش بھی شامل تھی۔ اور شوہر کبھی اپنے خاندان کے کسی فرد سے اسے ملاتا نہیں تھا۔

مستان کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ نصیبن نے ایک ماں کی طرح زیور، کپڑوں کی تیاری کی۔

''اب تو تین سال ہو چکے...... خوشی کا موقع ہے۔ اب تو لے جاؤ جی!''

''جا کے دیکھے نیں کیا؟'' مستان خان نے ہاتھ سے اخبار نہیں چھوڑا۔

''تم لے کو گئے تو ایسا نہیں ہوئیں گا...... بچے مجھے چھوٹی امی بولیں گے۔ میں ان پر، اپنے بچوں پر ممتا کا خزانہ لٹا دوں گی۔''

......لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سامنے سے ایک چپی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا اور ایک دن جب رہا نہ گیا تو وہ بن بلائے ہی ساز و سامان کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گئی۔

''السام علیکم''۔ دروازہ کھولتے ہی اسے پہچان کر چھوٹی بیٹی نے جھٹ سے سلام کیا تو اس نے خوشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم رقیہ ہونا بیٹا!''

''جی''۔

''اماں سے کہنا چھوٹی امی آئی ہیں۔'' اور اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑا تھیلا رقیہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''تمہاری آپا کی شادی کے لیے......''

چھوٹی امی!!'' بچی نے حیرانی سے پوچھا اور تھیلا لے کر اندر چلی گئی۔

''ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے۔ تمہارا جو رشتہ ہے وہ ہمارے ابا سے ہے۔ اس دروازے پر پھر قدم نہیں رکھنا'' کچھ دیر بعد چار بیٹے دروازے پر آئے اور اس سے کہہ گئے۔ نصیبن کی اس کھلے دروازے کے اندر ایک قدم رکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ کافی دیر تک وہ چوکھٹ کے کنارے بیٹھی رہی۔

''جا نصیبن! تیرا تحفہ بیٹی کے پاس پہنچ گیا۔'' ڈھول کی تھاپ پر شادی کے گیت، ''لال موٹر میں دولہا آیا، بولو دلہن بی تمہاری اماں نے کیا کیا دیے؟ بولو دلہن بی؟'' کے ساتھ لڑکیوں کی ہنسی اس سے جیسے کہنے لگی۔

نصیبن کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

''کیا رکھا ہے اس خود غرض دنیا میں!'' اس نے حج کی ٹھان لی۔ بینک سے تمبا کو کے کھیت بیچ کر جمع کیا ہوا پیسہ نکالا۔ گھر بیچا اور شوہر کے ساتھ حج کو جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اپنا ساجھے والا گھر اس نے اپنے بھانجے کو بیچ دیا، اس شرط پر کہ۔ ''اگر میں حج سے

لوٹ آئی تو مجھے ایک پلنگ کی جگہ دے دینا''۔

بچے ہوئے پیسوں سے نصیبن نے گنگور سے پینتالیس منٹ کی دوری پر واقع جڑواں شہر وجے واڑہ میں ایک گھر خریدا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں لوٹ کر نہیں آؤں گی۔'' سب سے چھوٹی بہن کرائے کے گھر میں رہتی تھی، اس کو یہ گھر رہنے کے لیے دیتے ہوئے وہ بولی۔ ''مر گئی تو تو لے لینا...... اور اگر واپس آ گئی، تو مجھے کرایہ دے دینا۔'' دونوں بہنوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

پانی کے جہاز سے جب وہ حج سے لوٹی تب اس کے چچیرے بھائی کی بیوی ممبئ میں تھیں۔ نصیبن بھی اس سے ملنے گئیں۔ کپڑے کی ایک وزنی پوٹلی چپکے سے ان کے ہاتھ میں تھما کر وہ بولی

''چھپا کر باہر لے جاؤ۔ تمہارے لیے بھی بہت سارا سامان لائی ہوں۔'' بہت سارا سامان اس کے ساتھ تھا۔

''نہیں شریاں والی اماں، سونا پکڑا جائے تو جیل ہو جاتی ہے۔''

گنٹور پہنچ کر رشتہ داروں کی دعوت میں نصیبن نے اسے خوب کوسا اور اس کو چھوڑ کر باقی سب کو تحفے بھی دیے۔ حج سے لائی ہوئی سوغات کھجور، آب زم زم اور تسبیح اسے کچھ روز بعد پہنچا بھی آئی۔

حج سے لوٹ کر نصیبن نے بھانجے سے اپنے بیچے ہوئے گھر میں ایک پلنگ کی جگہ لے لی۔ ادھر بہن دس روپے کرایہ دینے لگی تھی۔ حج کے کچھ ہی دنوں بعد مستان خان ساتھ کھانا کھاتے وقت دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ بچے باپ کی میت اس کے گھر سے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ پتہ نہیں کیسے اس دن اسے کسی نے سوتن کے گھر کے آنگن میں شوہر کی میت پر رونے سے نہیں روکا۔

بعد میں سنا، ان لوگوں کو ریلوے کوارٹر چھوڑنا پڑا اور وہ تنگی میں گزارہ کرنے لگے۔

نصیبن کے پاس پہلے شوہر کے دھن دولت میں سے اب کچھ نہیں بچا تھا۔ سب کچھ بک چکا تھا۔ دراصل اس زمانے میں حج کا سفر بڑا مشکل ہوتا تھا۔ اسے بھی یہی لگا کہ وہ

بچے گی نہیں۔ سوچا ہی نہیں تھا کہ پھر سے ایک بار تنہائی اس کے نصیب میں آ جائے گی۔ اسے لگا جیسے یہ تنہائی اس بار ہمیشہ کے لیے آئی ہو۔

کھانے کی وہ ہمیشہ سے چٹوری تھی لیکن اب تنگی میں الگ الگ قسم کے پکوان بنانا کیسے ممکن ہوتا!

اس زمانے میں عورتیں زچگی میں بہت مرتی تھیں۔ بچے کے جنم پر کچی پکی دائیوں کے ہتھے چڑھ جاتیں یا بیمار پڑ جاتیں تو علاج بھی صحیح نہیں ہوتا۔ رنڈوا ہونے پر ان کے مردوں کی فوراً شادی کر دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو چہلم تک بھی نہیں رکتے تھے۔ ننھے سے بچے کو چالیس دن بھی کون سنبھالے گا۔ دس بیس دن کا بچہ ہی دوسری ماں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر عورت نے دوسرا نکاح کرنا چاہا تو اس کو گناہ سمجھتے۔ پھر نصیبن تو تین شادیوں والی تھی۔ خاندان میں سبھی اور خاص طور پر گنٹور میں رہنے والے نصیبن کے چچیرے بھائی حارث اس سے بڑی نفرت کرتے تھے۔

''مرد بننے چلی ہے۔ ہونہہ'' اسے دیکھ کر وہ حقارت سے بڑبڑاتے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ان کی اکلوتی بیوی بھی ان کی تین نمبر کی بیوی تھیں۔

وہ جس گھر کھانا مانگنے جاتی اسے کھانے کے ساتھ کچھ نہ کچھ پیسہ بھی خیرات میں اللہ کے نام پر مل جاتا۔ اس طرح کا کافی پیسہ اس نے بینک میں جمع کر رکھا تھا۔ اپنی بیوہ ممیری بہن کو اس نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ایسی بیوائیں اس وقت شہر میں بہت سی تھیں، جو دوسروں کی خدمت کر کے جی لیتی تھیں۔

''میرے کو کھانا ڈال گے ماں! ہے تو ذرا دے۔'' رشتہ داروں کے گھر وہ کھانے کے وقت پہنچ جاتی۔ مانگ کر کھانے لگی تھی۔ ایسے ہی مانگتے کھاتے وہ ایک دن گنٹور سے ورنگل پہنچی اور وہاں کے سب سے شاندار مکان کے آگے کھڑی بھاری بھرکم، کسے ہوئے بدن اور چوڑے چہرے والی، گوری گوری اونچے قد کی اور سجی دھجی زیوروں سے پیلی ہو رہی وہ عورت بہت مٹھاس سے چلائی تھی۔

'''شریاں والی اماں !!تم یہاں؟''

''السلام علیکم''، نصیبن کے ذہن میں گونجا...... ہاں یہ وہی تو ہے رقیہ......!......

گنٹور ریلوے کوارٹر میں دروازہ کھولتے ہی جس چھوٹی بچی نے جھٹ سے سلام کیا تھا اور اس نے خوشی سے اس کے سر پر ممتا کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''رقیہ؟''، یہ اس کے تیسرے شوہر مستان خان کی بیٹی رقیہ ہی تھی۔ ہو بہو باپ جیسی تو تھی۔ نصیبن کو مستان خان بری طرح یاد آ گیا۔

''جی''، رقیہ نے سلام کیا۔

دستر خوان پر بگھارا کھانا، مرغی کا قورمہ، امباڑے کی کھٹی بھاجی اور تلی ہوئی کھاری مچھلی کا مزہ لیتے ہوئے نصیبن نے سوچا۔ رقیہ کی شادی بھی اسی کی طرح گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی وجے واڑہ میں ہوئی تھی۔ شوہر اسے بہت چاہتا تھا۔ مگر بچوں کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ دعا، گنڈے، تعویذ، درگاہیں، مزار...... کچھ بھی تو کام نہ آیا تھا......

ایک صبح پورے علاقے میں ہلچل تھی۔ رقیہ کو اس کے گھر والے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ پکا مسلمانوں کا محلّہ تھا وہ۔

''کہاں گئی؟''

''کدھر گئی؟''

''صبح صبح کہاں نکل گئی؟''

جب کئی دنوں تک اس کی خبر نہیں ملی تو لوگوں نے کہا۔

''مر مرا گئی ہوگی، پولس میں شکایت درج کرادی گئی۔ گنٹور اور وجے واڑہ کے درمیان کے پل کے نیچے سے بہتی ہوئی کرشنا ندی کے کنارے سے کانسٹبل لال ساڑی کی پہچان کرا گیا۔

''پکا ہو گیا کہ رقیہ ندی میں ڈوب کر مر گئی'' اور رو دھو کر فاتحہ درود پڑھ ڈالا گیا۔ نصیبن کے تیسرے شوہر کی بیٹی رقیہ کے بارے میں پورا گنٹور جانتا تھا...... ایک پل میں نصیبن کی آنکھوں میں ریل سی پھر گئی سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔

کھانے کے بعد رقیہ چاندی کا پاندان کھول کر بیٹھ گئی۔

''میرے اماں، بھایاں، بہناں اور اُنوں کیسے ہیں؟'' رقیہ نے ہر ایک کے بارے میں پوچھا۔

''سوب کے گھر ہنستے بستے ہیں مگر اُنے، تیرا آدمی اب تک چھڑا گھومتا ہے۔ تمہاری یاد میں جیتا ہے۔بس گھر سے مسجد، مسجد سے گھر۔''

''کچھ کام کرتے ہیں؟'' رقیہ نے اپنی عادت کے خلاف دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''کبھی کیا تھا کیا؟'' نصیبن ہنسی، ''اس کی اماں بھی اب نہیں رہیں۔ بہن کے گھر کھاتا ہے اور اللہ اللہ کر کے اپنے گھر پڑا رہتا ہے...... تم تو یہاں خوش ہو؟ دوسرا کر لیے نا تُم! کیا قصہ؟''

''السلام علیکم'' رقیہ نے پان کا بیڑہ دیتے ہوئے سلام کے بہانے بات بدلی۔ اماں کو جا کے بتا دینا میں یہاں ہوں...... زندہ ہوں۔'' رقیہ بات بدل کر نصیبن کو وداع کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر تیری اماں دروازہ کھولی اور مجھ سے کچھ بولی تو!......''

نصیبن نے اسے غور سے دیکھا...... پیٹ کے کافی اوپر سے سیدھی بندھی ہوئی ساڑی، جس کی مہریاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ پنجوں کے پاس مہریوں کے دائیں اور بائیں طرف ساڑی کچھ اونچی تھی۔ جس میں سے اس کے ذرا سے پھیلے ہوئے پیروں میں قیمتی دو پٹیوں کی چپلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے لمبا، ڈھیلا، پلین بلاؤز پہنا ہوا تھا، جس سے پیٹ نظر نہ آئے۔ پھولی ہوئی پف والی آستین تھی اور گلے میں فرل لگی ہوئی تھی۔ پلو دوپٹے جیسا ایک ساتھ گچھے کی طرح بائیں کندھے پر پڑا تھا اور سینے پر پھیلا ہوا بھی۔ پلو کو پیچھے سے کھینچ کر کمر میں کھونسا ہوا تھا۔ جس سے جسم کا شیپ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ جوڑے میں خوشبودار کیوڑے کے ہرے پتوں کے ساتھ لال اور سفید پھول ٹنکے ہوئے تھے۔

''اور شریاں والی اماں'' ! رقیہ سمجھ گئی کہ انہیں یہ ٹالنا پسند نہیں آیا۔

''چھوٹی امی بولیں گے نئیں کیا بیٹا؟'' نصیبن نے بات کاٹی۔

''.............. میں زندہ ہوں کر کے میرے میکے والوں کو ضرور خبر دینا۔'' دہلیز پر پہنچ کر اس نے دوبارہ یاد دلایا۔

''اِتا خوبصورت گھر...... ! کیا سونے سے جگمگاتی ہے نا ماں انے !!'' نصیبن تو مانگ کر کھاتی تھی، کتنے لوگوں سے ملتی تھی۔ کتنے گھر گھومتی تھی، مگر لوٹ کر گنتور آئی تو گاؤں بھر میں آشکار کرتی نہیں پھری۔ صرف رقیہ کی ماں کو بتایا۔ آخر بیٹی تھی۔ ماں، بھائی، بہن کوئی رقیہ سے ملنے ورنگل نہیں گیا۔ سنکی بڑھیا کی باتوں کی جانچ کرنے کے لیے کون اتنی دور جاتا۔ ویسے بھی یہ لوگ بڑے غریب ہو چکے تھے۔ رقیہ بہت چھوٹی تھی جب اس نے ماں باپ کے گھر میں کھانے پینے کا سکھ دیکھا ہوگا۔ پھر جیسے ہاتھ سے دن پھسل گئے تھے۔ باپ کی موت کے بعد چھوٹی سی عمر میں اسے حیدر آباد کے 'بنجارہ ہلس' علاقے میں رہنے والی دور کی ایک رشتے دار کے گھر ان کی بیٹی کو سنبھالنے کے لیے رکھ دیا گیا تھا۔

ورنگل سے لوٹے نصیبن کو آٹھ دس دن سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ ایک شام مغرب کی نماز کے بعد محلے کا ایک لڑکا سندیسہ پہنچا گیا۔

''شریاں والی نانی مسجد میں تم کو کوئی آدمی پوچھتا تھا۔''

''کون؟ مجھے کون پوچھے گا؟''

''معلوم نہیں گنتور کا نہیں لگتا...... میں نے نام نہیں پوچھا تھا۔ وہ مجھ سے نہیں کسی دوسرے سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''ارے بابو قوال! تم؟؟؟؟'' نصیبن حیرت بھری خوشی میں جھوم گئی۔

''جھوم برابر جھوم شرابی والے!!'' اس کے منہ سے نکلا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔ سنبھل کر بولی، ''تم وہی بابو قوال ہونا!...... جس کا گلا بڑا اسریلا تھا، ہے نا؟''

''ہاں میں رقیہ کا دوسرا شوہر بابو قوال۔'' نصیبن حیران رہ گئی۔

نصیبن کو یاد آیا۔ ورنگل سے ایک دن قوالوں کا ایک ٹولہ وجے واڑہ آیا تھا۔ اور وہیں رقیہ کے سسرالی گھر کے قریب کرائے کا گھر لے کر رہنے لگا تھا۔ انہیں دنوں تو رقیہ کے کرشنا ندی میں ڈوبنے کی بات پھیلی تھی۔

وہ شادیوں کا موسم تھا۔ گرمیوں میں موگرا خوب پھولتا ہے۔ پھولوں کی خوشبو میں ہی تو شادی کا اصلی مزہ ہوتا ہے۔ شادیوں میں قوالوں کی اچھی کمائی ہو جاتی تھی۔ یہ قوال کافی دنوں تک ایک جگہ رہتے تھے وہیں گھر بار بھی بسا لیتے۔ کہیں اور بلاوہ آنے پر وہاں سے چل بھی پڑتے تھے۔ جولائی میں سارے قوال چلے گئے تھے۔ آخر شادیوں کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ اب کہیں کہیں ایک آدھ ہی شادی ہوتی۔ آندھرا کے اس علاقے میں یہ موسم بارشوں کا تھا...... یہ بابو قوال کافی دنوں تک اپنی بیوی کے ساتھ وہیں رہا...... ''اچھا تو گھر یار اٹھاتے اٹھاتے رقیہ کو وہیں سے لے اڑا تھا!'' نصیبن نے سوچا

''تم ورنگل ہمارے گھر آئی تھیں نا؟'' بابو قوال نے سوال کیا تو وہ اپنے قیاسوں سے باہر آ گئی۔

''ہُو''

''تمہارے ورنگل سے جانے کے بعد تیسرے دن اچانک رقیہ کہیں غائب ہوگئی۔ غائب کیا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔'' بابو قوال بغیر رکے بولتا رہا۔

—''اسے ڈھونڈتا ہوا میں اس کی پہلی سسرال وجے واڑہ جا پہنچا۔ پتہ چلا وہ لوگ گھر بیچ کر کہیں جا چکے۔ اندازہ تھا کہ رقیہ ضرور اپنے میکے کے شہر گنٹور میں ہی کہیں ہوگی۔ میں نے اس کے میکے کے محلے مفتی اسٹریٹ کے قریب 'چھوٹی مسجد' میں بسیرا کیا اور شریاں والی اماں تم کو ڈھونڈ نکالا''، بابو نے گہری سانس لی اور بولا، ''بڑھیا تم نے ہی اسے بھڑکایا ہوگا۔ ضرور تم رقیہ کے پہلے شوہر کی ایجنٹ ہو!'' وہ کڑوا ہو گیا۔

''نہیں، جھوٹ ہے یہ۔''

''اپنی نیت ثابت کرنے کے لیے شریاں والی اماں! تمہیں رقیہ کو چتا میت کے پچھواڑے بلا کر مجھ سے بات کرانی ہوگی۔''

رات کے پچھلے پہر چادر اوڑھے ہوئے لوٹ کر نانی اکیلی آئیں اور ایک لفافہ بابو قوال کے ہاتھ میں تھما دیا جسے پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے۔

''میں نہیں آ سکتی۔ میں تمہارا خاندانی زر زیور الماری میں رکھ آئی ہوں جس کی

چابی پیاز کے چھیکے میں رکھ دی ہے۔''

یاد ہے، ہم جس ڈاکٹرنی کے پاس گئے تھے اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھے بچے ہو ہی نہیں سکتے۔ مگر تمہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ بات تم نے مجھ سے چھپالی تھی نا!...... اسی لیے چلی آئی۔ سچ مانو گے اگر کہوں، میری زندگی کے بہترین دن وہی سات سال تھے، جو تمہارے ساتھ گزرے تھے۔''

چٹھی پر نام تھا نہ پتہ۔ مگر پڑھ کر بابو قوال ایسے تڑپا کہ نانی کو بھی خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''میں نہیں رہتا تیرے بغیر...... رقیہ...... میں نہیں رہتا تیرے بغیر...... میں نہیں جیتا تیرے بغیر...... رقیہ......نانی میں نے اس کے کہنے سے ہی بڑی بیوی کو اچھا رکھا تھا۔ اس کو بھی الگ گھر دیا تھا''، آخر اس نے آنسو پونچھ کر کہا،''مجھے نہیں چاہئے بچے وچے!''

اس نے پھر تڑپ کر آسمان کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ میں نہیں رہتا تیرے بغیر......رقیہ۔''

رقیہ اپنے گھر کے باہر پہلے ہی کی طرح کھاری مچھلی، چاکلیٹ اور بسکٹ کے ڈبے شطرنجی پر بچھا کر بیچا کرتی۔ اب گنفور کتنا بدل گیا ہے...... کتنی بڑی بڑی دوکانیں، عمارتیں۔ مگر پرانا محلّہ ابھی نہیں بدلا تھا۔

اس کا پہلا مرد کب کماتا تھا مگر اس کی بے حد چاہت چھلکی پڑتی تھی۔ کچھ سال رقیہ نے اس کی بہت خدمت کی، بہت آرام دیا۔ اس کی ران میں بہت بڑا پھوڑا ہو گیا ہے۔ خون، پیپ صاف کرتی۔ کھلاتی پلاتی، قریب کے 'پالاس یتری اسپتال' میں ڈاکٹر سے علاج کرواتی اور گھر کے سامنے بیٹھ کر روٹی کا جگاڑ بھی کرتی ہے۔

نصیبن کے پچیرے حارث بھائی نہیں رہے۔ اب نصیبن کا ان کے گھر آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان کی بہو نگار کو اسے پہلی بار دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی تھی۔ نصیبن بڑی ڈھیلی ڈھالی پیوندوں والی شلوار پہنتی ہے۔ کپڑے ایسے کہ لگتا ہے جیسے قمیض پر قمیض اور شلوار پر شلوار پہنے ہوئے ہو۔ جیسے نمازی رومال کو پیچھے باندھتے ہیں، ویسا ہی

ایک پٹکا آگے کی طرف پیشانی پر باندھتی ہے، جس میں اس کے بال چھپ جاتے ہیں۔ اس پر دوپٹہ ایسے اوڑھتی ہے کہ گھابن کر دائیں کندھے پر جا پڑتا ہے۔

''شریاں والی نانی کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سو برس کی سانولی جھریوں والی بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھوں والی، دبلی سی جادوگرنی، بھکارن کے بھیس میں ٹوہ لیتی پھر رہی ہو۔'' نگار اپنی ساس سے کہتی ہے۔

''کیا کہتی ہو بیٹا؟''

''کندھے پر پرانا کھٹملی تھیلا دیکھ کر اکثر سوچتی ہوں کیا اس میں کوئی جادو کی پڑیا ہے یا کسی کو گڑیا بنا کر جھولے میں ڈال لیں گی۔'' نگار ہنس کر کہتی ہے۔

نگار کی ساس سنجیدہ ہو جاتی ہیں تو وہ بات بدل کر کہتی ہے۔ ''اچھا امی میں ہمیشہ شریاں والی نانی سے رقیہ اور ان کی اپنی کہانی جان لینا چاہتی ہوں مگر ہمت نہیں ہوتی۔''

''تو ایک دن بلا لوں گھر!'' ساس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

''ڈرپوک کہیں کی! وہ نگار کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہتی ہیں۔

''رقیہ نے ایسے کیوں کیا امی؟'' نگار سنجیدگی سے پوچھتی ہے۔

''قوال کے ساتھ کیوں چلی گئی؟''

''خماری''...... انہوں نے اپنا جواب افسوس کے ساتھ دیا۔ ''جوانی اور عشق کا نشہ۔''

''اور اس کے پہلے شوہر نے اسے دوبارہ کیسے رکھ لیا!''

''یہ اس کی محبت''۔ اس جواب سے نگار کو تسلی نہیں ہوئی ''اور آج کل شریاں والی نانی کی آواز محلے میں کیوں نہیں آتی؟ کیا مانگتے مانگتے گنئور سے باہر چلی گئی ہیں؟''

''اب وہ کہیں نہیں جاتی۔ آج کل اس کا پیٹ جو ٹھنڈا ہو گیا ہے......''

''مطلب؟''

''رقیہ کی اماں کا انتقال ہوا...... تعزیت کے لیے شریاں والی اس کے گھر گئی۔ محلے کی عورتیں اور میں بھی وہیں تھی۔ اس دن رقیہ نے ماں کے ایصال ثواب کے لیے قرآن

خوانی رکھوائی تھی۔ مگر خود بیمار تھی۔ نصیبن کو دیکھتے ہی بستر سے اٹھ کر رقیہ اس کے پیروں پر جھکی اور انہیں چھولیا۔

''یہ کیا کر رئے ماں تم؟'' نصیبن چونکی۔

''آپ کے پیر پڑری ہوں۔'' اس کی بات سن کر نصیبن شرمندہ ہوگئی۔

'کیوں کر رئے ماں تم ایسے؟''

اماں باوا کو بھی ایسا ہی کرتی تھی نا!......اب امی نہیں رہیں......آپ میری چھوٹی امی ہیں نا!!!

☆☆

میٹر گرتا ہے!

''ٹائم کیا ہوا ہے صاحب؟......'' ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کا میٹر گراتے ہوئے پوچھا۔

''ساڑھے تین......'' مسافر نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''ساڑھے تین!!!''، ڈرائیور نے ٹیکسی بائیکلہ پولس سٹیشن سے بائیں لی۔ بائیکلہ بھاجی مارکیٹ کے باہر کھڑے گاہک کا انتظار کرتے یا سامان لے جاتے ہوئے پاٹی والوں میں سے ایک بوڑھا پاٹی والا گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ٹیکسی کی ٹکر سے خود کو بچا کر منہ ہی منہ بڑبڑایا اور 'انا صاحب پاٹل فلائی اوور پل' کے نیچے روڈ پار کر کے کولین میں غائب ہو گیا۔

''اوہ! آج کا دن ہی ٹھیک نہیں ہے صاحب۔ آدھا دن خراب ہو گیا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے گہری سانس لی۔

''کیوں؟'' مسافر نے آرام سے ٹیکسی میں پھیلتے ہوئے پوچھا۔

''کیا صاحب، ساڑھے تین بج گئے، ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔'' اس نے ٹیکسی کا آئینہ ایڈجسٹ کرتے ہوئے کہا۔ اُسے مسافر ایک ادھیڑ عمر کا بزنس مین سا دکھائی دیا۔ آسمانی شرٹ اور کالی پتلون میں اس کا کھلا ہوا رنگ اُس پر بھلا لگ رہا تھا۔ اُس نے اپنی گھنی بھوؤں اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرا، پھر دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں کو درست کیا۔

''صبح چھوکرے کو پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ سرکاری میں ڈاکٹر لوگ کا ہڑتال چلتا ہے نا! جبھی سے سالا پرائیویٹ ڈاکٹر لوگ کا مزہ ہو گیا ہے۔...... یہ ڈاکٹر کا

فیس پانچ سو روپیہ ہے، پن اپُن سے دو سو روپیہ ہی لیا...... پہچان والا ہے نا!...... جانتا ہے کہ اپُن ڈرائیور ہے، جاستی دے نہیں سکتا...... بولتا تھا، 'اچھا کیا پہچان رکھا اور آیا۔ اوپر سے 'تھینک یو' بھی بولا۔''، ڈرائیور نے ایک لمحہ اپنا سر کھجایا، پھر بولا،

''وہاں سے نکلا...... چھوکرے کو گھر چھوڑا، ٹیکسی نکالا...... پن آفس ٹائم کدھر تھا؟...... ابھی ورلی نا کے سے بھائکلہ تک تو ایمپٹی ہی آنا پڑا۔ اب جا کے بھاڑا ملا ہے......''۔ ڈرائیور نے گہری سانس لی۔

''ڈاکٹر نے پانچ سو ساٹھ روپئے کی دوا لکھ کے دیا ہے صاحب۔ مگر آج خالی دو سو روپئے کا کمائی ہوا ہے۔ ابھی تین سو ساٹھ روپیہ اور بنانے کا ہے۔ تب جا کر لڑکے کا دوائی آئے گا۔'' ڈرائیور اچانک چُپ ہو گیا۔ اس نے اپنی شرٹ کے کیسے سے تصویر نکال کر دکھائی۔ ''میرا بیٹا صاب!''

''اچھا اچھا......!'' شاید ہی مسافر نے تصویر کی جانب دھیان دیا ہو! مگر اس کی دلچسپی محسوس کر کے ڈرائیور کو جیسے جوش آ گیا۔ وہ اپنی دھن میں ہی کہے جا رہا تھا۔ ''سالا! سولہ سال کا چھوکرا ہے۔ تین دن سے بیمار ہے۔ گولی کھاتا ہے...... کالج کو جاتا ہے۔ کبھی گولی کھاتا ہے، سو جاتا ہے...... سالا بولتا نہیں ہے کہ پپا، میرے کو بخار ہے...... پہلے بولا ہوتا تو پچاس روپئے کی دوائی میں کام چل جاتا تھا نا!...... ابھی پانچ سو ساٹھ روپیہ کا پھٹکا لگا دیا۔''

''کیوں، تمہارے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟'' مسافر نے پوچھ لیا۔

''ڈاکٹر بولا، ملیریا ہو گیا ہے۔ ابھی اور لیٹ لاتا تو کامنی کا بھی چانس تھا...... یہ کامنی کیا ہوتا ہے صاحب؟'' اس نے اپنے سانولے ماتھے کا پسینہ اپنی خاکی شرٹ کی آستین سے پونچھا تو تیل لگے بالوں کی ایک لٹ انجانے میں ہی اس کی پیشانی پر بکھر گئی۔

''جانڈس...... آں پیلیا...... کاویل......کاویل!'' مسافر کو ڈرائیور کو سمجھانے میں وقت لگا۔

''اچھا...... اچھا...... اپنے اِدھر دو تین لوگ کامنی پیٹ میں اُتر کر مر گیا۔ بہت بڑا بیماری ہے صاحب۔'' ٹیکسی ڈرائیور چپ ہو گیا۔ مسافر بھی چپ تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے

بعد ٹیکسی ڈرائیور پھر شروع ہوگیا۔

''صاحب کچھ بھی بولو۔ ممبئ میں تو ابھی ٹیکسی چلانے کا مزہ نہیں رہا۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' مسافر نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''ارے صاحب، ممبئ میں اتنا ٹریفک ہوگیا ہے کہ کیا بولے گا!...... مزہ بولے تو سالا ائیر پورٹ کا بھاڑا مارنے والے لوگ کا ہے۔ ائیر پورٹ سے واشی جاتا ہے...... ائیر پورٹ سے کولابہ جاتا ہے۔ ہیرو لوگ کا سٹائل مارتا ہے...... سٹی میں تو ٹیکسی چلانے کا مزہ نہیں ہے صاحب۔ زندگی بھر ٹیکسی چلا کے بھی ممبئ میں لاکھ روپیہ کا ایک جھونپڑی نہیں لے سکتا۔ بس دو ٹائم کا کھانا مل جاتا ہے۔''

''اوہ!'' ٹیکسی ڈرائیور کو لگا جیسے مسافر نے احساس کے ساتھ 'اوہ' کہا ہو۔ 'آخر کچھ کم، کچھ زیادہ کے فرق سے ممبئ میں سب کی کیا یہی کہانی ہے!' اس نے سوچا۔ اُسے مسافر سے ہمدردی سی محسوس ہوئی۔ اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''صبح چار بجے اٹھتا ہوں تو رات ساڑھے گیارہ بجے سوتا ہوں۔ اوپر سے بجلی کا دو مہینوں کا دو ہزار کا بل آیا ہے۔ کمپلینٹ کرنے گیا تو بیسٹ والا بولا۔ 'ڈرائیور صاب، پہلے بل بھر دو، بعد میں انکوائیری ہوئے گا۔' کیا بولنے کا صاحب! دو ہزار کدھر سے آئے گا۔ نہیں بھرا تو بجلی کاٹ دے گا۔''

''اور نہیں تو کیا!'' کہہ کر مسافر چپ ہوگیا مگر ڈرائیور اپنی دھن میں کہتا رہا۔

''ایسا ہی پانی کا کنیکشن کٹ گیا ہے۔ صبح چار بجے اُٹھ کر میونسپلٹی کے نل پر پانی بھرنے جانا پڑتا ہے۔ پانچ بجے سے عورت لوگ کا ٹائم ہوتا ہے نا! بہت کِٹ کِٹ چک چک رہتا ہے...... ابھی دیکھو صاحب، وہ سامنے سے جو تیسرا جھاڑ دِکھتا ہے نا؟'' اسی وقت سگنل کی لال بتی دیکھ کر ڈرائیور نے ٹیکسی رُکا دی۔ مسافر نے ٹیکسی کے باہر نظر دوڑائی۔ پڑوس میں ایک دوسری ٹیکسی سے ایک بوڑھا شخص اُتر رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل اُسے چھو کر آگے بڑھ گئی۔ مسافر نے ہرے رنگ کی مینارہ مسجد سے آگے نظر دوڑائی اور مسجد سے لگی دوکانوں سے اُٹھتی مٹھائیوں اور خستہ نان خطائیوں کی خوشبو دھیرے سے اپنی سانسوں میں

اتار لی۔

''ہاں...اُتنی دور جانا پڑتا ہے پانی لانے کو......'' ڈرائیور نے سانس لے کر کہا۔ ''رات کو اتنا تھک کر آتا ہے، پھر صبح کو پانی بھرنے کا ڈیوٹی......بچّہ لوگ کو بولتا ہے تو بولتا ہے، 'پپا! ہم لوگ کو شرم آتا ہے۔' میں بولتا ہوں، 'تم لوگ کو نہانے کو شرم نہیں آتا ہے، پانی بھرنے کو شرم آتا ہے! اب میں تم لوگ کا باپ رہ کے میرے کو شرم نہیں آتا ہے تو تم لوگ کو کائے کو آتا ہے؟'، تو بولتا ہے، 'پپا تم کو چلتا ہے، ہم لوگ کو نہیں چلتا۔' بولو......ابھی کیا بولنے کا؟''

''چہ......چہ......'' مسافر نے افسوس کیا۔

''اتنی محنت اپُن کائے کو کرتا ہے؟......اِسی لئے نا کہ بچّہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ اپنا نہیں تو اِن لوگوں کا زندگی بن جائے......ہے نا صاحب؟''

''ہاں سچ ہے۔'' مسافر نے سر ہلایا۔ پتہ نہیں کیوں ڈرائیور کو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔

''روز رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے گھر جاتا ہے، تو عورت بوم مارتا ہے کہ، 'ہم کو ٹائم نہیں دیتا ہے۔ خالی پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے۔' کیا بولیں گا صاحب......!''

مسافر خاموش رہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو لگا کہ وہ شاید اس کے درد میں اپنا درد محسوس کرنے لگا ہے!

''کل رات تو ایسا ہوا کہ ساڑھے گیارہ بجے گھر پہنچا۔ عورت کھانا گرم کرنے کو گئی تو اپُن سو گیا۔ بِنا کھائے پیے ہی سو گیا۔ سیدھا صبح کو ہی اُٹھا۔''

''اوہ!......اچھا......مجھے منیش مارکیٹ کے سامنے اتار دینا......'' مسافر نے یک لخت کہا تو ڈرائیور کو لگا کہ شاید اُس کا درد پوری طرح سے محسوس کرنے سے پہلے ہی مسافر کی منزل آ گئی ہو!

''ٹھیک ہے صاحب۔'' ڈرائیور اپنی دُھن اور اپنی زندگی سے جیسے باہر آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے خیال ضرور اس کے ذہن سے گزر گیا، ویسے بھی میری زندگی سے اپنی زندگی

کا مقابلہ کرنے میں مسافر ہی کا نقصان ہے!'

''میٹر کتنا ہوا؟''

''پینسٹھ روپے صاحب۔'' اس نے بالکل ٹیکسی ڈرائیور کے انداز میں جواب دیا۔

''یہ لو۔'' مسافر بغیر ایک سیکنڈ رُکے تیزی سے وہاں سے نکل کر بھیڑ میں کھوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی مسافر کی طرف پلٹے بغیر میٹر سیدھا کیا اور دائیں جانب پرندوں اور جانوروں کے مارکیٹ کی جانب دیکھنے لگا۔ پنجروں میں پھڑ پھڑاتے طوطوں اور سلاخوں کی طرف لپکتے بندروں کو دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''گام دیوی چلوگے......'' ؟ بغیر آستین کی چھوٹی شرٹ اور جینس پینٹ میں ملبوس ایک نازک اندام نے اپنی حیران آنکھوں سے بائیں وِنڈو میں جھانک کر پوچھا...... اور ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی جواب دیۓ بغیر میٹر گرا دیا۔

شرارہ

رعنا پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے اسے حال سے حواس باختہ گزرتے دیکھا تو بھاگی بھاگی آئیں۔ وہ سامنے ہی بستر پر پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔ رعنا حد درجہ حساس تھی۔ اس کا علم تو انہیں تھا، کوئی بھی چھوٹی سی بات ان کی آنکھوں کے پیمانے بھر دینے کے لئے کافی تھی مگر یہ پھوٹ پھوٹ کے رونا......! بڑی آپا نے حیرت سے چھوٹی آپا کی جانب دیکھا اور وہ ان کا اشارہ سمجھتے ہوئے دوڑتی ہوئی امی کے پاس گئیں۔ امی پھولدار کپڑے کو رعنا کی قمیض کی شکل دے رہی تھیں، دوڑی ہی تو آئیں۔ گھبراہٹ کے عالم میں امی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور چیخنے لگیں، ''اے لڑکی پھوٹ تو کیا ہوا؟'' انہیں بمبئی کی دوڑتی بھاگتی زندگی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے اچھا بھلا آدمی ابھی باہر جائے اور اس کے مرنے کی خبر ہی نہ آئے۔ رعنا تو اپنے ابا سے ملنے آفس گئی تھی اور واپسی پر یہ..........!

''اری کہہ تو کیا ہوا آخر؟ تیرے ابا تو ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں امی'' ۔ کہہ کر رعنا امی کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

''پھر؟'' امی کے چہرے پر اطمینان کے لہر دوڑ گئی۔

''امی وہ جاوید بھائی......''

''کیا ہوا جاوید کو؟......پھر ڈانٹ دیا اس نے تجھے؟''

''نہیں امی۔ ان کا ایکسیڈنٹ......''

''کیا؟؟؟'' ایک ساتھ تین آواز چیخیں اور ایک لمحہ پہاڑ سا ان پر سے گذر گیا۔ آنکھیں بیتاب ہونے لگیں۔

''میں نے دیکھا...... میں نے دیکھا...... اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' روتے روتے اس نے بتایا۔

''کیا دیکھا بولو نا؟''

''دیکھا کہ جاوید......''

''جاوید کیا؟...... کیا ہوا جاوید کو؟''

''وہ بم......!!''

''بم؟؟؟ کیسا بم؟؟ کیا وہاں بم پھٹا تھا؟''

''ہاں ہاں وہ بم تھا۔''

''بم؟؟؟ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو!!!......''، خادمہ پریشان ہوکر درمیان میں بول پڑی۔ لیکن اس کی بات پر کسی کا دھیان نہیں گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہاں بم پھٹا؟'' منجھلی نے جاننے کی جلد بازی کی۔

''لوگ بول رہے ہوں گے آپس میں۔ تم کیا پوچھ رہی ہو؟''، امی نے منجھلی کو جھڑکا۔ ''اس سے پوچھو جاوید کو اس نے کہاں دیکھا؟''، امی نے گڑبڑاہٹ میں منجھلی سے غلط سوال پوچھنے کو کہا مگر منجھلی اب تک سنبھل چکی تھی۔

''جاوید کو کیا ہوا ہے رعنا؟ بتاؤ نا!''، منجھلی نے خادمہ کو آواز دی، ''بڑی بی! ذرا رعنا کے لئے پانی......''

سب کی ہڑبڑاہٹ سے رعنا کچھ سنبھلی۔

''میں ابا کے آفس سے لوٹ رہی تھی، سگنل پر میری بس رکی ہوئی تھی۔''، امّی جانتی تھیں کہ ممبئی کے اِس علاقے کے نیچے اسٹیشن بنا ہوا ہے۔ اور اوپر سے گزرنے والی گاڑیوں سے اسٹیشن پر ٹھہرتی گزرتی ٹرینوں کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

''پھر............'' چھوٹی آپا سے صبر نہ ہوسکا۔

''پھر............ میں نے دیکھا...... بھگدڑ مچی ہوئی تھی...... پھر سڑک پر بھی ٹرافک جام ہوگئی تھی...... چیخوں کی آوازیں آ رہی تھی۔......''

''ہوں، کیا سڑک پر؟''

نہیں سڑک پر نہیں''

تو اسٹیشن پر؟''

''ہاں اسٹیشن''

''بم کہاں پھٹا تھا؟ اسٹیشن پر؟''......لوگ دھڑا دھڑ گرنے لگے...... جیسے انہیں ڈھکیلا جا رہا ہو۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا؟...... ارے جلدی بولونا رعنا۔'' منجھلی ذرا چڑ گئی۔ ''اتنا ڈرامہ کیوں کرتی ہو؟''، اس کے لہجے کی جھنجھلاہٹ سے اِمی نے اسکے کندھے پر ایک دھپّہ لگایا۔ کہا، ''پرسکون ہونے دو اسے منجھلی!''

''امی جاوید بھائی گرے۔ وہ گر گئے......''، رعنا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک سے بتاؤ بیٹا!''

''ڈبل ڈیکر بس کے اوپری حصے سے میں نے انہیں پُل سے نیچے ممبئی سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر دیکھا۔ انہوں نے سفید شرٹ اور کالی پتلون پہن رکھی تھی۔''، رعنا بچوں کی طرح رونے لگی۔ ''بم پھٹا...... چلتی ٹرین سے جاوید بھائی گر گئے۔ اور ان کا جسم......''، رعنا نے اپنا چہرہ اپنی ہی گود میں چھپا لیا۔

''نہیں............!'' سب چیخیں۔

یہ تم نے کیا خبر سنادی رعنا! جاوید اپنی دوست کی شادی میں جا رہا تھا...... اوہ خدا جانے اطہر بھائی اور بھابی جان پر کیا گذرے گی۔ جوان جہان بیٹا...... ابھی سہرا بھی تو نہیں دیکھا اس کا......؟''، امی نڈھال ہوگئیں، تینوں بہنیں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

صلاح الدین شاہ نے ممبئی آ کر بزنس کو خوب چمکا لیا تھا۔ ان کے بعد بھائی اور

سالے بھی دھیرے دھیرے یہیں آئے اور بسنے لگے۔ مگر صلاح الدین شاہ نے بیوی بچوں کو یہاں نہیں بلایا، حالانکہ مجگاؤں میں سرکل کے قریب 'گلشن اپارٹمنٹ' کے دسویں منزلے پر انکا اپنا دو بیڈروم ہال، کچن کا خوبصورت فلیٹ تھا۔ اُن کی بچیوں نے اعظم گڑھ میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ دونوں بڑی بیٹیوں کی شادیاں غیروں میں کی تھیں۔ اب تیسری بیٹی کے لئے انہیں اپنے بھائیوں اور سالوں کے بیٹے پسند آئے تھے۔ مگر ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ رعنا کے لئے کون سب سے زیادہ موزوں رہے گا۔ سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کو انہوں نے سب بچوں سے زیادہ آزادی دے رکھی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس بات کا فیصلہ اپنی بیوی اور بیٹی پر چھوڑ دیا تھا، اسی لئے انہیں اب ممبئی بلالیا تھا۔ اسی لئے ان کی بڑی دونوں بیٹیاں بھی ممبئی بلائی گئی تھیں۔ رعنا تھوڑی سی آزادمزاج تو تھی لیکن مشرقی شرم وحیا کو اس نے تجا نہ تھا۔ اس ایک سال کے عرصہ میں ماں اور بہنوں نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کا عندیہ معلوم کریں۔ سارے چچازاد اور ماموں زاد ملتے ملاتے رہتے ہی تھے۔ رعنا ان سب سے اچھی ہی رہتی مگر اپنے ماموں زاد جاوید سے اس کی ذرا نہ بنتی۔ بات بات پر دونوں جھگڑتے۔ آج صبح بھی دونوں میں خوب جھگڑا ہوا تھا۔ ممبئی سینٹرل پر جاوید کو دیکھ کر رعنا کا پارہ دوبارہ چڑھ چکا تھا اور اگر جاوید اس کی جانب دیکھ لیتا تو اس کی قہر آلود نگاہوں سے ضرور دوچار ہوتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی دگر تھا۔

چاروں کو کچھ ہوش نہ تھا۔ شاہ صاحب کو فون کرنے کا امی کو خیال تو آیا مگر ان پر پہلے ہی دو بار دل کے حملے ہو چکے تھے اب کوئی بری خبر شاید ہی برداشت کر پاتے۔ امی پریشان تھیں۔ کیا کریں کیا نہ کریں! کوئی بیٹا بھی تو نہیں کہ اس سے مشورہ کرتے۔ چھوٹی آپا اور بڑی آپا کی آنکھیں سرخ اور بھاری ہو چکی تھیں۔ مگر رعنا کا تو حال ہی اور تھا۔ وہ روتے روتے نیم بیہوشی کی حالت میں جاوید سے معافی مانگتی، ''جاوید! مجھے معاف کردو۔''

اور بس۔

آدھا گھنٹہ جانکنی کی حالت میں گزر گیا کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ بوڑھی خادمہ نے، جو دوسرے کمرے کے دروازے میں کھڑی چپکے چپکے آنسو بہارہی تھی، دھیرے سے

آ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی جاوید کی مسکراتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ خادمہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر دوڑتی ہوئی اندر گئی اور زور سے چلائی۔ ’’جاوید تو بخیر ہیں!...... آپا جاوید آئے ہیں!‘‘

امی چونک پڑیں۔ چھوٹی آپا اور بڑی آپا کچھ سمجھ نہ پائیں۔ ’’بڑھیا یوں بھی آدھی سنکی ہے۔ نہ جانے کیا بک رہی ہے۔‘‘ منجھلی بولی۔

’’ہاں زندہ!!‘‘ جاوید نے خادمہ کی آواز سن کر کہا۔

’’اور وہ بم؟؟‘‘ بڑی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

’’بم کی خبر پہنچ گئی...... بم نہیں...... بم کی افواہ تھی وہ!‘‘

’’جس سے بھگدڑ مچی تھی اور تم گرے تھے؟‘‘

’’ہاں میں گرا تھا۔ مگر بچ گیا۔ بیس پچیس لوگ تو بھگدڑ میں زخمی ہوئے ہوں گے! کود جو پڑے تھے، چلتی گاڑی سے!...... لیکن آپ کو کیسے خبر......!!‘‘

رعنا نے جاوید کو دیکھا مگر اس کا اثر کچھ دیر سے ہوا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ پھر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دوڑی اور جاوید سے لپٹ گئی۔ ’’جاوید مجھے معاف کر دو۔‘‘، اس کے بھولے چہرے پر زلفیں اُڑی ہوئی تھیں، سوجی ہوئی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور بے چین نظریں جاوید کے خوبرو چہرے پر ٹکی ہوئیں۔ جاوید گھبرا گیا۔ اور رعنا کا حسین چہرا اس کے بازوؤں میں ڈھلک گیا۔ اب جاوید بُری طرح پریشان ہو گیا۔ یہ ’لڑکی ہے! صبح جھگڑ رہی تھی اور اب......‘ اتنے میں ان کی نظر اپنی پھوپھی جان، چھوٹی آپا اور بڑی آپا پر پڑی۔ امی کی رم جھم آنسو برساتی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور چھوٹی اور بڑی آپا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆

خلش بے نام سی

''ہیلو مس چودھری!''۔ ممبئی جیسے اجنبی شہر میں ریلوے اسٹیشن پر ایک خوب رُو نوجوان کو اپنے کو وِش کرتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ بہت دیر سے وہ روبی کے انتظار میں پلیٹ فارم کی ایک خالی بینچ پر بیٹھ کر پریشان نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں''

''آپ کی تعریف......؟''

''بمبئی کے فائیو اسٹار ہوٹل میری مٹھی میں ہیں''

بے ساختہ صبیحہ کی نظر اُس کی مٹھی پر پڑی جواب کھل چکی تھی۔ وہ شرمندہ ہوگیا

''شکریہ مجھے کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا ہے۔''

''آشیانہ'' میں بھی نہیں؟''———اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ اس شخص نے پہلے تو اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا اور اب روبی کے بنگلہ کا نام لے رہا ہے۔ وہ پریشان ہو اُٹھی۔

''کون ہیں آپ اور میرے متعلق اتنی تفصیل سے کس طرح جانتے ہیں؟'' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''آپ روبی کے بھائی جان ہیں!''

''جی ہاں۔ روبی کا............''

اُس نے بے پروائی سے کہا اور وہ شرمندہ ہوگئی۔

''چلیے گاڑی باہر کھڑی ہے۔''

''روبی نہیں آئی؟''اُس کی جھجک دور ہو چکی تھی۔

''نہیں۔'' قدرے سنجیدہ اور مختصر جواب ملا۔صبیحہ ایک ہی شخصیت کی پل بھر میں دو متضاد کیفیات دیکھ کر کچھ بے چین نظر آرہی تھی۔ اُس نے چپ چاپ دونوں سوٹ کیس اُٹھالیے۔نواز نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ بھاری سوٹ کیس کار تک لاتے لاتے صبیحہ تھک گئی۔ وہ جھک کر کار کا دروازہ کھولنے لگا تھا۔صبیحہ اُسے دیکھتی رہی اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سامان کا کیا کرے۔ بالآخر نواز کی بے توجہی ختم ہوئی اور وہ اس کے قریب آیا اور ڈکی کھول کر واپس چلا گیا۔صبیحہ نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور سوٹ کیس اٹھا کر اندر رکھ دیا۔ اِتنی دیر میں نواز اسٹیرنگ سنبھال چکا تھا۔روبی نے اگلا دروازہ کھلا دیکھا تو اندر جا بیٹھی۔'عجیب شخص ہے یہ بھی'،وہ سوچنے لگی۔

گاڑی مین گیٹ کے سامنے رُکی تو صبیحہ نے روبی کو منتظر پایا۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے لگ گئی۔نواز بے تحاشہ کھانسنے لگا۔صبیحہ جھنجھلا کر پرے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ بنگلہ کے احاطے میں دائرہ نما چمن اور اُس میں کھلے طرح طرح کے گُلاب دیکھ کر وہ باغ باغ ہوگئی۔ جیسے سفر کی ساری تکان دور ہوگئی ہو۔

''اللہ کتنے خوب صورت ہیں!''صبیحہ نے بے تابانہ کہا۔

''تو اپنے متعلق میری رائے غلط نہیں!''نواز نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔روبی ہنسنے لگی تو اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔نواز نے اُسے تھام لیا۔صبیحہ کو بھائی بہن کی محبت پر بے حد پیار آیا۔

''بھائی جان صبی آپ کے متعلق تھوڑے ہی کہہ رہی ہے۔''، لیکن نواز نے سنی ان سنی کردی۔

''کیا صبیحہ کو باہر ہی سے گھر دکھانے کا ارادہ ہے؟''نواز کی بات پر روبی مسکرانے لگی۔

''اپنی سہیلی کے لیے تو اسپشل ڈشز تیار کر رکھی ہوں گی''چلتے چلتے نواز نے پوچھ لیا۔

''ہاں، اور نہیں تو کیا آپ کے لیے بناتی؟ آپ تو ٹھہرے............''

''گھر کی مرغی!''نواز نے بات کاٹی۔

ہال کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ خوبصورت کارنسوں پر دیدہ زیب ہاتھی دانت، سنگِ مرمر اور شیشے کے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رنگین پتیوں سے آراستہ پودے، زمین پر خوش نما قیمتی قالین اور دیواروں پر خوبصورت فریموں میں خوش رنگ مناظر کی عکاسی تھی اور چھت پر نزاکت سے تراشے ہوئے جھومر آویزاں۔ ہلکے سبز رنگ میں ماحول خواب ناک ہو رہا تھا

''کیسا لگا؟'' روبی نے ستائش کی تمنا میں پوچھا۔

''کون؟'' صبیحہ کی محویت ٹوٹی۔

''پگلی! میں بھائی جان کے متعلق نہیں پوچھ رہی ہوں۔'' روبی نے اُس کے چٹکی لی۔ صبیحہ نے گھبرا کر نواز کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ سجائے، آنکھیں بند کیے آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ روبی نے صبیحہ کو اپنے بے موقعہ سوال پر شرمندہ ہوتے دیکھا تو نواز سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں بھائی جان؟ چلیے اُٹھیے لڑکیوں کی بات چیت کے درمیان آپ کی موجودگی چہ معنی دارد؟''

''اچھا لڑکی صاحبہ میں چلا! کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ ایک دوست کے گھر دعوت ہے۔ اُس کی بہن میرے لیے لذیذ کھانے دستر خوان پر سجائے میری منتظر ہوگی۔ خدا حافظ!'' وہ اُٹھ کر جانے لگا۔

''ارے نہیں نہیں بھائی جان!'' روبی دوڑی۔ ''آپ کو میری قسم!''

''تمہاری قسم سے تو میں رُکنے والا نہیں!''

''تو پھر؟''

''اپنی سہیلی کی قسم دے دو۔''

''ہائے اللہ بھائی جان! اسے کچھ ہوگیا تو خالہ جان میری جان لے لیں گی''

''مزے سے لے لیں۔ میری جان تو چھوٹے۔''

''بھائی جان پلیز۔ میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔ فیرنی بنائی ہے بھائی جان۔ آپ کو اُس کی قسم!''

''اچھا بھائی۔اب فیرنی کی قسم دے دی ہے تو رُکنا ہی پڑے گا ورنہ زندگی بھر فیرنی بیگم ہم سے روٹھی رہیں یہ تو ہم سے برداشت نہ ہوگا۔''

کھانے کی بڑی میز پر ایک طرف دونوں سہیلیاں بیٹھی تھیں اور دوسری طرف نواز۔نواز نے اپنی فیرنی کی پیالی ختم کی تو صبیحہ کی یار کرلی۔صبیحہ کو زور سے ہنسی آئی۔نواز حیرت زدہ رہ گیا۔اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''آپ ہنستی بھی ہیں......؟''

روبی جھنجھلائی۔''کھانا تو چین سے کھانے دیجئے بھائی جان بے چاری کو!''نواز چپ ہوگیا اور آخر تک کچھ نہ بولا۔صبیحہ کو خاموشی کھلنے لگی۔

روبی کے بیڈروم میں دونوں سہیلیاں لیٹی ہوئی تھیں۔روبی نے اپنا البم نکالا۔اور اپنے والدین کی تصویریں صبیحہ کو دکھاتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔وہ اُسے بتانے لگی کہ کس طرح اُس کے والدین ہوائی حادثہ کا شکار ہوگئے تھے۔صبیحہ کے والد کو گذرے چار پانچ ہی مہینے ہوئے تھے وہ ایک متوسط طبقہ کی رُکن تھی تین بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ بڑے بھائی ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔صبیحہ کی والدہ نے روبی کو لکھا تھا کہ وہ اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے پاس بلالے ورنہ یہ پگلی تو گھٹ گھٹ کر جان دے دے گی،صبیحہ اپنے والد کو یاد کر کے چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔روبی اپنا غم بھول کر اُسے سمجھانے لگی۔''تم تو خوش نصیب ہو صبی!تمہاری ماں تو تمہارے پاس ہیں۔اتنے سارے بھائی بہن تو ہیں۔مجھے دیکھو جو ہیں سو بھائی جان ہیں مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی''۔

صبیحہ نے روبی کے غم کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''تیرے بھائی جان تجھے کتنا چاہتے ہیں تو چلی جائے گی تو بے چارے بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔''

روبی ہنس دی''بھائی جان مجھے اپنے سے الگ ہی کب کریں گے۔''

''پھر بھی ایک نہ ایک دن تجھے شادی تو کرنی ہی پڑے گی۔''

''بھائی جان کہتے ہیں میں اپنی پیاری بہن کے لیے ایسا دولہا تلاش کروں گا جو اسے اپنے گھر لے جانے کی بجائے خود آ کر یہیں رہے۔'' صبیحہ نے روبی کے چہرے پر مسرّت کی بے شمار کرنیں دیکھیں اور تصوّر میں نواز کو شریر نظروں سے مسکراتا ہوا محسوس کرنے لگی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ تینوں نے سیکنڈ شو دیکھا، مزاحیہ فلم تھی۔ سب نے انجوائے کیا۔ پھر وہاں سے وہ سب مل کر گیٹ وے آف انڈیا چلے گئے۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں صبیحہ کے دل کو گدگدانے لگیں۔ لانچ میں بیٹھ کر انہوں نے سمندر کی سیر کی۔ گھر پہنچتے پہنچتے بارہ بج چکے تھے۔ صبح روبی بخار میں پھنک رہی تھی۔ کچھ ہی دنوں پہلے اسے فلو ہوا تھا۔ کل بھی اسے بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ صبیحہ کو رِسیو کرنے نہ جا سکی تھی۔ لیکن صبیحہ کو تو صرف دس دن یہاں رہنا تھا۔ اُسے کمپنی دینے کی خاطر وہ پکچر چلنے کی ضد کرنے لگی تھی اور نواز نے روبی کی ضد پوری نہ کی ہو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ اور نتیجہ سامنے تھا۔ نواز پریشان ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اور ٹائیفائیڈ کا خطرہ بتایا تھا۔

''بھئی صبی! اپنی تو چھٹی ہو گئی۔ اب تم اکیلے کیسے دیکھو گی یہ شہر؟''

''ہم کیا مر گئے ہیں؟'' نواز قریب ہی بیٹھا دواؤں کے لیبل پڑھ رہا تھا۔

''اچھا آئیڈیا ہے بھائی جان! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو صبی کو کمپنی دے دیجئے نا۔''

''نہیں روبی میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' صبیحہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں بھئی مجھے بھی اعتراض ہے''

''کیوں بھائی جان''؟

''نا بابا جوان جہان لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔''

''دقیانوسی مت بنئے بھائی جان۔ بچّی دعائیں دے گی آپ کو۔''

''اچھا؟ پھر تو قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے!''

''یہ آپ تین بار قبول ہے کیوں کہہ رہے ہیں! میں کوئی قاضی تو نہیں۔''

''گواہ تو بن سکتی ہو نا؟''

''صرف گواہ! واہ بھائی جان خوب کہی آپ نے بھی!''

دونوں کو اپنے متعلق اتنی بے باکی سے باتیں کرتے دیکھ کر صبیحہ اُٹھ کر باغ میں چلی آئی۔

بڑی مشکلوں سے روبی نے اپنی قسمیں دے کر صبیحہ کو نواز کے ساتھ جانے پر راضی کیا۔ سب سے پہلے نواز اُسے جو ہو لے گیا۔ صبیحہ خاموش خاموش سی تھی۔ پانی میں نواز اس کا ہاتھ تھام کر دور تک لے گیا وہ بس بس کرتی ہی رہ گئی لیکن نواز اُسے کھینچتا ہوا بڑھتا ہی چلا گیا۔ لہروں کے شور میں صبیحہ کا احتجاج ڈوب گیا اور لہریں ان پر نچھاور ہوتی چلی گئیں۔

روبی گھر پر اپنی آپا کی نگرانی میں رہتی تھی۔ وہ ایک خاصی مقبول شاعرہ تھی۔ روزانہ بہت سے خطوط اُس کی بیماری سے متعلق آتے، بے شمار شعراء اور ادباء کا اُس کے گھر جمگھٹا لگا رہتا۔ اکثر وہ انہیں کھانے پر روک لیتی۔ دعوتیں ہوتی ہی رہتیں۔ لیکن جب سے وہ بیمار ہوئی تھی گھر میں اکثر خاموشی ہی چھائی رہتی۔ نواز اور صبیحہ بھی صبح کو نکلتے تو شام ہی کو لوٹتے۔ نواز نے دس دنوں کے لیے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ اپنے ساتھیوں میں اس کا نام ہونہار انجینئر کی حیثیت سے لیا جاتا تھا۔ روبی کو رفتہ رفتہ یہ بات کھلنے لگی تھی کہ نواز اس کی بیماری پر چھٹی لے کر اس کی تیمارداری کرتا رہتا لیکن اس بار اُس نے چھٹیاں تو لیں مگر اُس کی خاطر نہیں۔ صبیحہ کی خاطر۔ مسلسل بیماری نے اُسے چڑ چڑی بنا دیا تھا۔

ایک صبح صبیحہ ناشتہ کی ٹرے لے کر روبی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ روبی نے کوئی جواب نہ دیا، آنکھیں بند کر لیں۔

''کیا بات ہے روبی؟''

''کچھ نہیں''۔

''نواز کے دوست کی شادی کی تقریب ہے نا۔''

''یہ نواز کہنا تم نے کب سے شروع کر دیا ہے۔'' صبیحہ کے رُخسار گلابی ہو گئے۔

وہ کیسے کہتی، نواز نے اپنی جان کی قسمیں دے کر اُس سے اپنا نام کہلوانا شروع کیا ہے۔

''آج ہم لوگ تاج محل ہوٹل جائیں گے۔''

''تو میں کیا کروں۔ میں نے باندھ تھوڑے ہی رکھا ہے تمہیں۔''

صبیحہ حیرت زدہ رہ گئی۔ شام کو اُس نے نواز سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرلیا

''آؤ روبی چلیں۔''

''میری اب کیا ضرورت رہ گئی ہے بھائی جان۔'' نواز نے روبی کے لہجے کی اداسی محسوس کرلی تھی۔

''ارے بھئی ایک ہی کمرے میں پڑے پڑے اکتا جاؤ گی۔ آؤ، تمہارا سوپ کھانے کی میز پر رکھوادیا ہے لیکن خیال رہے دوسری ڈشز کی طرف نظر بھی مت ڈالنا، صبیحہ بہت لذیذ کھانا بناتی ہے۔''

روبی صبیحہ کی تعریف سے دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگی۔

''آؤ روبی!''، صبیحہ نے اُس کا بازو تھاما تو اُس نے اُسے بے تحاشا جھڑک دیا۔ اُس کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں، 'میرے چہیتے بھائی کی محبت مجھ سے چھین لینے والی ڈائن تُو ہی تو ہے۔'

''ارے میری بہنا! اب کچھ ہی دن تو ہمارا ساتھ رہے گا''، روبی چونکی۔ ''سکندر چچا تجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے مضطرب ہیں۔ پھر آگرہ میں بیٹھ کر اپنے میاں کے ساتھ کھانا کھاؤ گی۔''

روبی کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ بھائی جو اُسے کبھی اپنے سے الگ کرنے کی بات نہ کرتا تھا۔ اب ڈاکٹر جمشید کے ساتھ بیاہ کر اُسے آگرہ بھیجنا چاہتا ہے۔ اُس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُسے ان سب باتوں کی ذمہ دار صرف صبیحہ نظر آتی۔ صبیحہ! جو کبھی اُس کی پیاری سہیلی تھی اور جسے وہ اپنے بھائی جان کے لیے پسند بھی کرچکی تھی، وہ آج اُسے اپنی سب سے بڑی دشمن نظر آرہی تھی۔

صبیحہ کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ دل میں ایک بے نام سی خلش لیے گھر لوٹ آئی تھی۔ نواز نے وعدہ کیا تھا کہ روبی کے صحت یاب ہوتے ہی وہ اس کے گھر آئے گا اور اُس کی امّی سے اُسے مانگ لے گا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ نواز کے ساتھ گذارے ہوئے ہر لمحہ کی یاد کو اُس نے دل کے نہاں خانے کے کسی نرم گوشے میں چھپا رکھا تھا۔ کبھی کبھی روبی کی زہریلی باتیں اُسے دکھ پہنچاتیں لیکن وہ اُسے بیماری کا چڑچڑاپن کہہ کر دل کو تسلی دی لیتی آخر یہی تو لڑکی تھی جو ہمیشہ اپنے بھائی کی باتیں اُس کے سامنے کرتی اور بھائی کی پسند سے اس کے اپنے کردار، خدوخال، رنگ روپ اور تعلیم و تربیت کا موازنہ کرتی رہتی۔

بالآخر ایک دن دونوں بھائی بہن اُن کے گھر آپہنچے۔ امّی نے خوب خاطر مدارات کی۔ اُنہیں نواز کی آمد کے مقصد کا انداز ہوگیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ بیٹی کی حالت کچھ اُن سے چھپی ہوئی تو نہ تھی لیکن روبی جو اکثر چھٹیاں اُن کے یہاں گذارا کرتی تھی اور صبیحہ کی امّی سے بہت گھل مل کر باتیں کرتی رہتی تھی، اس بار اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر انہیں ہول آتا تھا۔

آج دوپہر نواز کھانا باہر ہی کھانے والے تھے۔ سب دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ روبی صبیحہ سے دور ارشد اور امجد کے درمیان بیٹھی تھی۔

''خالہ جان، بھائی جان کے لیے اتنی خوبصورت، امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کے پیام آرہے ہیں کہ کہہ نہیں سکتی۔'' روبی کے بڑی بوڑھیوں کے سے انداز کو صبیحہ اور اُس کی امّی نے بُری طرح محسوس کیا۔

''کیوں نہ آئیں بیٹی۔ نواز ہے بھی تو لاکھوں میں ایک!''

''ہاں، تبھی تو۔'' روبی نے صبیحہ کو دیکھا ''لڑکیاں بھائی جان کے گرد یوں منڈلاتی ہیں جیسے بھوکی بلّی چوہے کو دیکھ کر جھپٹ پڑے۔'' صبیحہ کا نوالا حلق سے نیچے نہ اُتر سکا۔

''اور پھر لڑکا امیر ہے، تنہا ہے۔ سارے خاندان کی کفالت کر سکتا ہے۔''

صبیحہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ امّی نے حیرت سے روبی کی طرف دیکھا اور پھر موضوع بدلنے کے خیال سے مسکرا کر پوچھا:

''تمہاری شادی کب کر رہے ہیں نواز''

''میری شادی؟ ہاں۔ پچھلے دنوں جمشید بمبئی آئے تھے تو میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ میں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی! وہ بھی راضی ہو گئے ہیں۔'' امّی مسکرانے لگیں جوان لڑکی کا اپنی شادی کی نسبت اتنے کھلے الفاظ میں کہنا اُنہیں عجیب سا محسوس ہوا۔

''تو بیٹی تم ممبئی ہی میں رہو گی؟''

''ہاں'' بڑے طنز سے کہا گیا!! میرے والد جائیداد میں میرا بھی تو آدھا حصّہ لکھ گئے ہیں۔''

''امّی چونک گئیں ــــــ روبی نے اُن کے الفاظ کا غلط مطلب اخذ کر لیا تھا۔ وہ خیالات میں گم ہو گئیں۔ سب بچے چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ کھانا کافی لذیذ تھا لیکن روبی، صبیحہ اور امی ایک ایک نوالہ زہر سمجھ کر نگل رہی تھیں۔ آخر روبی نے خاموشی توڑی۔

''خالہ جان ہمارے آنے کا مقصد تو آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی..........'' امّی کا دل زور سے دھڑ کا۔

'نہیں تو''!

روبی ہنسی۔ ''صبیحہ بھائی جان سے.......... میرا مطلب ہے بھائی جان صبیحہ کا ہاتھ مانگنا چاہتے ہیں'' صبیحہ کا جی چاہا زمین پھٹ جائے اور اُسے اپنے میں سمو لے!

''ارے بھئی روبی! تمہیں ایک خوش خبری تو دینا بھول ہی گئی۔ صبیحہ کو مبارکباد دو۔ اس کا رشتہ میں نے اپنی سہیلی کے بیٹے سے طے کر لیا ہے؟''

روبی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح React کرے۔ صبیحہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ روبی کو کھاتا ہوا چھوڑ کر امّی بھی اُٹھ گئیں۔

صبیحہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی نیلے شفاف آسمان کو گھورے جا رہی تھی۔ اور امّی دروازے میں کھڑی دیر سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ آخر اُن سے صبر نہ ہو سکا اور ''صبی۔ میری بچی۔'' کہتی ہوئی وہ اس کی طرف لپکیں۔ صبیحہ اُٹھ بیٹھی۔ دیر تک وہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر آہستہ سے پوچھا ''کون سی سہیلی امّی؟''

''کوئی نہیں بیٹا۔ لیکن اس لڑکی کے رہتے تو ساری زندگی خوش نہ رہ سکے گی''

''امّی!'' کہہ کر وہ ماں کے سینے سے لگ گئی، کشادہ دریچے میں دور سے نواز اپنی کار سے دھول اڑاتا دکھائی دیا۔ صبیحہ کو محسوس ہوا جیسے کار کچی مٹی کو نہیں، اس کے سینے کو روندتی ہوئی گذرتی چلی جارہی ہو!۔

سلگتی راکھ

میں نے پراٹھے بہت بے دلی سے بنائے اور سبزی لے کر بیٹھ گئی۔ دل تھا کہ کسی کل چین نہ پاتا اور دماغ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگتا۔ جہاں ایک ننھے سے دِیے کے بجھنے سے پیدا ہونے والا دھواں اب بھی میری آنکھوں میں بہت ساری اداسیاں سمیٹ لانے کے لئے کافی تھا۔ یہ چراغ جو کبھی اپنی پیاری پیاری روشنی سے دو دلوں میں اُجالے ہی اجالے بکھیر رہا تھا۔ اسی کی روشنی میں تو میں نے اور ونود نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور شاید اُن قسموں کو کبھی توڑنا نہ پڑتا اگر میں نے۔۔۔

''اف کتنی تیز چھری ہے انگلی کاٹ گئی!''

شیلف میں سے میں نے پھٹے ہوئے سفید کپڑے میں سے پٹی پھاڑی اور انگلی پر لپیٹ لی۔

کتنی محنت سے میں نے اس کالونی میں اپنا مقام بنایا ہے۔ ہر پارٹی کی روحِ رواں یوں ہی تھوڑے ہی کوئی بن جاتا ہے۔ کہیں یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ مجھے تیاگنا نہ پڑے...... مرد تو ہوتے ہی شکی ہیں۔ کہیں شرت کو ان باتوں کا علم نہ ہو جائے۔

کتنے سہانے تھے وہ دن! نہ کسی بات کی چنتا نہ کوئی خلش۔ ونود سے میرے کلاس فیلو نے ہی مجھے متعارف کروایا تھا۔ وہ دجیہہ خدوخال، وہ مردانہ جسامت کہ کالج کی ہر لڑکی اس کی دیوانی تھی۔ لیکن ونود! تم تو ایک بے پروائی کے انداز سے ہزاروں فتنے جگاتے تھے۔ پہلی نظر میں تم مجھے ایک خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان لگے اور بس۔ پھر ڈبیٹ میں تم

نے مجھے ہرا دیا۔ سچ کہتی ہوں مجھے تم پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ لیکن میں تمہاری ذہانت کی قائل ضرور ہوگئی۔ کتنے اچھے تھے تمہارے پوائنٹس، تمہاری دلیلیں!

''ہائے رام! یہ سبزی تو یوں ہی پڑی ہے!''

میں اٹھی اور گیس کے چولہے پر ہانڈی رکھ کر گھی ڈال دیا۔

خط اگر میرا ہوا اور ماں جی نے اِسے پڑھ لیا تو غضب ہی ہو جائے گا۔ مانا وہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ لیکن بہو تو بہو ہی ہوتی ہے نا بیٹی تو نہیں کہ اس کا عیب چھپا لیا جائے۔

کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ونود تو دل جلا بیٹھا ہی ہوگا نہ جانے کیا لکھ بیٹھے۔ لیکن ہوسکتا ہے خط میرا نہ ہو۔ ماں جی کا خط کھول دوں تو وہ برا مان جائیں گی۔ یہ کیا تک ہوئی 'مسز کمار' لکھ مارا۔

لیکن ونود ایسا کیوں کرنے لگا۔ نہیں وہ میری زندگی میں آگ نہیں لگا سکتا۔ ہائے ونود! نہ جانے یہ ایک سال تم نے کیسے بتایا ہوگا!

'ارے سارا گھی جل گیا'، میں نے پتیلی اتاری، 'رہنے دو ابھی لچھی آ کر دھو ڈالے گی۔' میں نے دوسری پتیلی چڑھائی۔ گھی گرم ہوا تو ترکاری ڈالی۔ مرچ مصالحے ڈال کر ڈھکّن رکھ دیا۔

میں جانتی ہوں ونود! میں سب سمجھتی ہوں، تمہارے دل کی بے چینی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اب بہت دنوں تک سوگ مناتے رہو گے۔ شاید شادی ہی نہ کرو۔

مجھے یاد ہے وہ آخری ملاقات کا دن!

شام دھندلا رہی تھی۔ ہم جہانگیر آرٹ گیلری میں لگی تصویریں دیکھتے ہوئے کینٹین میں جا بیٹھے تھے۔ میں بہت خوش تھی اور خوب چہک رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں ہم ایک ہو جانے والے تھے۔ ہم دونوں کی ماؤں نے منظوری دے دی تھی۔ لیکن تم کچھ خاموش سے تھے۔

''شالو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''تو کہو نا۔ جھجک کاہے کی۔''

''دیکھو میں تمہیں اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا، مجھے پہلے ہی تمہیں بتا دینا

چاہیے تھا۔''

''خیر— ''تم ہولے سے مسکرا دیے۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔

''میں۔۔۔۔''

''ہوں۔۔۔۔''

''میری ماں نے پریم میں دھوکا کھایا ہے اسی لئے وہ جلد سے جلد ہم دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دینا چاہتی ہیں۔''

''ہوں ہوں۔۔۔۔!''میں سنجیدہ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

''اور میں اسی فریب محبت کی نشانی ہوں۔''

میں سَن رہ گئی جیسے دورانِ خون اچانک تھم گیا ہو۔لیکن تم کہتے رہے۔''ماں کے پڑوس میں ایک لڑکا رہتا تھا اُس نے اُسے بدنامی سے بچا لیا۔'' پھر میرے سفید پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے تم نے کہا تھا۔''میں جانتا ہوں شالو! تمہیں تکلیف ہوئی ہے لیکن اپنے کسی راز کو تم سے چھپانا میں اپنے پیار کا اپمان سمجھتا ہوں۔ ماں نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ تمہیں کبھی معلوم ہی نہ ہو سکے گا۔''

کافی پڑی پڑی ٹھنڈی ہوگئی۔تم شاید کہہ کر پچھتا رہے تھے۔لیکن میں ہوش میں ہی کب تھی کہ سنتی۔

آخر تم نے مجھے کار میں گھر پہنچا دیا۔

وہ چار دن مجھ پر نہ جانے کیسے گذرے۔کبھی دل چاہتا بس تمہاری ہو کر رہوں۔ کبھی احساس ہوتا کہ سماج میرے بچوں کو کیا کہے گا! ایک حرام کی اولاد کے بچّوں کو بھی حرامی ہی جانے گا۔میں اپنی نسل کو گندگی میں لتھڑا کیوں دیکھوں۔

تم انجینئرنگ کے کام سے میسور چلے گئے تھے۔میں نے ماں سے کہہ دیا مجھے ونود پسند نہیں۔انہوں نے مجھے سمجھایا بھی لیکن پھر اپنی سہیلی کے بزنس مین بیٹے کا خیال کر کے چپ ہو رہیں۔ ماں شاید سمجھی تھیں تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔اس خیال سے میرے دکھ کو دیکھتے ہوئے دس ہی دنوں کے اندر میری شادی کر دی۔شرت شاید مجھے بہت پسند کرتا تھا

اسی لیے تو جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔

تمہاری ماں مجھ سے ملنے آئیں۔ بہت روئیں۔ ماں سے شکایتیں ہوئیں۔ پھر میں نے سنا تم ممبئی واپس آنا نہیں چاہتے۔ کیوں؟ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن ونود! تم نے آج خط لکھ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ اگر خط میرے پتی کے ہاتھ لگ جاتا تو......

بیل بجی تو میں سر سے پیر تک لرز گئی۔ سامنے مینو کھڑی تھی، انٹر آرٹس کی یہ اسٹوڈنٹ ہر بات میں سمارٹ ہے۔

''بھابی جی کس چیز کا کباب بنا رہی ہیں؟''

''اوہ! بھا جی۔۔۔۔'' میں نے گیس بند کر دیا۔

''آؤ مینو۔ بیٹھو۔''

''نہیں بھابی۔ باہر سے گذری تو جلنے کی بو آئی سوچا بتا دوں۔ جلدی میں ہوں۔''

''کل شام کو چائے ہمارے ساتھ پی لینا۔''

''او کے بھابھی جی''! وہ پھرتی سے چلی گئی۔

سات بج چکے ہیں ماں جی لوٹتی ہی ہوں گی۔

کیا کروں کیا نہ کروں؟

خط ماں جی کا ہوا تو؟

پھاڑ کر پھینک دوں گی۔ پتہ بھی نہ چلے گا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے تپائی پر پیپر ویٹ کے نیچے دبے ہوئے خط کو نکال لیا۔

مسز کمار۔۲۔نوجیون کالونی۔ممبئی ۵۲

مجھے ونود کی یاد شدّت سے آرہی ہے۔ طنز کرنے میں بہت آگے ہیں جناب! سیدھے شالنی لکھ دیتے تو! سب سمجھتے میری سہیلی کا خط ہے۔

خط کھول کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ تو ماں جی کا خط ہے۔ کسی مسٹر کمار کی طرف سے۔

''جان سے پیاری موہنی!

بہت دنوں بعد خط لکھ رہا ہوں۔اپنے شرت کی شادی ہوگئی۔ بہت خوشی ہوئی مبارک ہو! بہو کیسی ہے؟ تم تو میرے تصوّر میں ویسی ہی جوان اور خوبصورت لڑکی ہو۔ مجھے دیکھو گی تو پہچان نہ پاؤ گی۔ زندگی سے بیزار موت کا طالب۔شانتی نے میری زندگی اشانت کر رکھی ہے پتا جی کی ضد اور زہر کھا لینے کی دھمکی نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔لیکن تم نے ہماری پریم کی نشانی کو خوب پروان چڑھایا۔ میں ہی بے وفا کہلایا۔ گو تُم نے کبھی شکایت نہیں کی۔ کبھی روپیہ بھی نہیں لیا۔ محنت سے شرت کو پالا پوسا، بڑا کیا۔ میرے نام کو بھی اپنے سے جدا نہ کیا۔

موہنی! اب بھی جی چاہتا ہے تمہیں موہن کہوں۔تم مجھے ہوس کا پتلا سمجھتی ہوگی۔ میں صفائی پیش کروں گا بھی نہیں۔ شاید ہوس کے پجاری ہی کنواری لڑکیوں کو ماں بنا دیتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا تم مجھ سے بدلہ لینا چاہو گی مگر تم تو دیوی ہو دیوی۔ میں ایک گنہگار ہوں۔ تمہارے چرنوں میں شما کی بھیک مانگتا ہوں۔تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ شما دان کر دو موہن۔

بس چند ہی دنوں کا مہمان ہوں۔ خط کن مشکلوں سے لکھا ہے اس کا اندازہ تو تم لگا ہی سکتی ہو۔

بیٹے کا منہ دیکھنے کو جیون بھر ترستا رہا میرے کیے کی اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہو۔

تمہارا گنہگار

-ارون کمار''

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔ قسمت کا فیصلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔جس کارن میں نے ونود کو جیون بھر کا روگ لگا دیا وہی بات میری زندگی کا کلنک بن چکی ہے۔بیل بج رہی ہے۔ میں نڈھال سی دروازہ کھولتی ہوں۔ سامنے ماں جی کھڑی ہیں۔

''کیا ہوا بہو؟ کچھ تکلیف ہے کیا؟ کس کا خط ہے؟''

وہ میرے ہاتھ سے خط لیکر پڑھتی ہیں، میں ان کا چہرہ دیکھ رہی ہوں اُن کی رنگت زرد پڑتی جا رہی ہے۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں۔لیکن میرا دل تو جیسے پتھر کا ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں اُمڈتا۔ دل ہے کہ احساس سے خالی ہے اور دماغ ہر سوچ سے عاری۔

☆☆

اُدھڑا ہوا فراک

''کیوں اس کمبخت کے پیچھے جان آدھی کر رہے ہو؟ ویسے ہی تمہیں کیا کم مصیبتیں گھیرے ہوئے ہیں''۔ مِیناز کی بات سن کر ایاز مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جس میں آنکھیں بے چینی اور اطمینان کا بیک وقت مظاہرہ کرنے لگتی ہیں۔ صوفے سے نیچے اس نے اپنا ایک پیر زمین پر رکھا، پھر دایاں ہاتھ زمین پر ٹکایا اور اس کے بعد اپنا باقی تمام جسم امیبا کی طرح نیچے گھسیٹ لیا اور اسی ڈھنگ سے گھسٹتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔

پولیو زدہ یہ نوعمر لڑکا دور کے رشتے میں مِیناز کا دیور لگتا تھا۔ مِیناز بھی سمجھتی تھی، انیس بیس سال۔ عمر کا وہ دور تھا جب کہ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش دل میں خواہ مخواہ مچلنے لگتی ہے۔ بچپن میں پولیو کا شکار ہو جانے کی وجہ سے اس کی کمر سے نیچے کا حصہ قریب قریب بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا، ٹانگیں پتلی پتلی، جو پوری طرح سیدھی بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔

ایک دن مِیناز نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''کیوں ایاز! کمر پر پتلون اتنی چست کیوں رکھتے ہو؟ تکلیف نہیں ہوتی؟''

''کہاں بھابی! میری تو کمر ہی اتنی ہے''۔ وہ ہنس کر بولا۔ ہنسی ہی اس کا ہتھیار تھی۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

وہ بڑا ہی خوددار تھا۔ اسی لیے رشتہ دار اسے خود پسند، مغرور اور جانے کیا کیا کہتے۔ مگر مِینازا سے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہی تو اس کی واحد دوست تھی۔

ایک دن ایاز نے پوچھا۔

''بھابی پیار کسے کہتے ہیں؟''

''پیار...... پیار کو کہتے ہیں''، میناز سے محبت کی تعریف نہ ہو سکی تو وہ ہنس پڑی۔

''پگلے محبت بھی کوئی لفظوں میں سمجھانے والی چیز ہے!''، میناز نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''مگر تو یہ سب کچھ...... بات ہے؟''

''بس دن بھر اسی کے خیالوں میں رہتا ہوں...... ایک پل بھی خالی نہیں جاتا۔ پھلوں کی دکان پر کام کرتے ہوئے اِسی دُھنکی کی وجہ سے ڈانٹ بھی کھا چکا ہوں۔''

''کم بخت تو، تو سورما نکلا!''

وہ ہنس دیا

''کون ہے وہ؟''

''ہے ایک''— پھر رُک کر خود ہی بولا،''سمیر کی بہن۔''

''سمیر کی بہن؟''

وہ مسکرایا۔

''واہ کیا انتخاب ہے؟ اتنی خوبصورت لڑکی!''

وہ شرما گیا اور اپنی مخصوص ایبائی چال میں وہاں سے کھسک گیا۔

''بہت اچھا''، اس نے بے ساختہ کہا۔

''کل ہم فلم دیکھنے گئے تھے''

''فلم دیکھنے تیرے ساتھ گئی تھی وہ!''

''سمیر اور اس کی چچازاد نیلو بھی تھی۔''

''پھر تو وہ تیرے پہلو میں ہی بیٹھی ہوگی۔''

''ہاں۔''، اس نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،''کیوں تعجب ہوا؟''، جواب نہ پا کر اسی نے پوچھا۔

''اچھا''—میناز سنبھلی۔''یہ کیسے؟''

''سمیر کے ایک طرف نیلو بیٹھی تھی، دوسری طرف وہ، اور پھر میں...... وہ میرے

ساتھ بڑی دوستی سے رہتی ہے نا!''

''پھر تجھ پر کون شک کرے گا''— میناز بولی۔ ''اچھا یہ بتا، کچھ بات بھی کی تو نے؟''

''بہت سی''

''نہیں بابا! اس بارے میں!'' میناز نے شریر لہجے میں کہا۔

''نہیں......'' وہ شرما سا گیا۔

''اچھا بتا فلم کیسی لگی؟''

''فلم کس نے دیکھی؟''

''آں!......اس نے بھی نہیں دیکھی؟''

''نہیں، ہم دونوں تو بس ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔''

''اور سمیر؟''

''وہ نیلو کا''

میناز نے زوردار قہقہہ لگایا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

اس روز وہ سیدھے میناز کی خوابگاہ میں چلا آیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔

میناز مشین پر بے بی کا فراک درست کر رہی تھی۔

''بھابی ایک بات پوچھنی ہے'' ایاز بہت سنجیدہ تھا۔

'ہوں'— میناز نے فراک کی کمر کی جھالریں ہاتھ میں لیں۔

''کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے؟''

میناز کو ہنسی آ گئی مگر ایاز کی صورت دیکھ کر اس نے دھاگے کے ساتھ ہنسی کو بھی ہونٹوں میں دبالیا۔

''ایاز وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اور حسین لڑکیاں......''

''بھابی......'' اس نے جیسے پورا مفہوم سمجھ کر بات کاٹ دی۔

''بھابی وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ بس اسکول، گھر کے کام کاج اور عبادت۔''

''ٹھیک ہے، مگر سولہ سترہ برس کی عمر کی محبت بعد میں عقل، سمجھ اور ذمہ داری کی نذر ہو جاتی ہے...... تم کیا سمجھتے ہو، وہ تم سے شادی کر لے گی؟''

''میں ہی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا بھابھی! یہ تو اس کی ذات پر بڑا ظلم ہوگا۔''

''چھوڑو ایاز، یہ دل کو بہلانے والی باتیں ہیں۔ نہ وہ، نہ اس کے گھر والے اس سلسلے میں تمہیں پسند کریں گے۔''

''پھر بھی بھابی، کیا آج وہ مجھے چاہتی ہے؟''—اس نے قطعی طور پر جواب مانگا۔

''ہوسکتا ہے۔''

''میں نے تو آپ کو سب کچھ بتلا دیا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ کیا کہتی ہیں۔''

''لگتا تو ہے اسے تم سے محبت ہے مگر......'' مینا ز نے یونہی اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا اور آگے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی، مگر اس نے بات کاٹ دی۔

''بس بھابی، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ یہ دن ہی میری زندگی کا سرمایہ ہوں گے......بس—میں یہی سننا چاہتا تھا''۔

وہ ایک لمحہ بھی نہیں رکا۔ دھیرے دھیرے اپنی ایمبائی چال سے کمرے سے نکل گیا، شاید وہ کچھ اور سننا ہی نہیں چاہتا تھا— مشین پر تیزی سے چلتے ہوئے میناز کے پیر رک گئے۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اب اس ادھڑی ہوئی فراک کو کہاں سے سیے!

☆☆

منّت

ممبئی سے پنڈھر پور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی، نرم سخت دھوپ میں سر پر پھیٹا باندھے، لکڑی کی دِنڈی (پالکی) میں وِٹھل کی مورتی لئے آگے بڑھی چلی جارہی تھیں۔ پونے، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلع کے آخری گاؤں باوڑا سے آگے بڑھی۔ باوُڑہ میں ہون راؤ اپنی بہن ملکتا اور ماں شانتا، جسے وہ 'آئی' کہتے تھے، کو لیے ٹولی کے ساتھ ہولیا۔ باوُڑہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ پورے گاؤں میں کوئی پانچ سو گھر ہوں گے۔ گاؤں کے آس پاس کھیت ہیں جن میں گیہوں، جوار اور گنّے کی فصل ہوتی ہے، یہ بہت شانت گاؤں ہے۔ یہاں ہفتے میں ایک دن یعنی جمعہ کے دن ''آٹھوڑے بازار'' (ہفتہ بازار) لگتا ہے۔ جس میں سبزیاں کھانے پینے کی چیزیں، کرانہ، راشن، اور تھوڑا بہت کپڑا فروخت ہوتا ہے۔ باقی دنوں میں خریداری کے لیے گاؤں والوں کو 'آکلُج' جانا پڑتا ہے۔ یہیں ان لوگوں کا بڑا سا گھر ہے، آئی ملکتا کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں۔

''اگلی بار تبھی آؤں گی، جب میری منوتی پوری ہوگی۔''

''ہے وِٹھل پانڈو رنگ! میری لیک (بیٹی) کو شادی لائق بنادے۔'' اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے عقیدت سے کہا تھا۔

اس وقت ملکتا اٹھارہ سال کی تھی۔ گدرائے جسم کی، تیکھے نین نقش، درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ، شوخ رنگ چوڑیوں سے ہاتھ بھرے ہوئے، بیچ کی مانگ، دو چوٹیاں لال ربن

سے بندھی ہوئی، بڑے گھیر کے لہنگے جیسا ٹخنوں تک کا پر کر، اور شرٹ جیسا چھوٹا کرتا، ماتھے پر کم کم کا ٹیکہ۔۔ کھیت پر بابا کو کھانا دینے جاتی، تو گاؤں کے لڑکے آہیں بھر کر دیکھتے...... بن کی آنکھ چل جاتی اور وہ فوراً آنکھ پکڑ کر رگڑنے لگتا، کیونکہ رک کر اسے ملتا گھورتی۔

''شادی کرے گی میرے سے؟''

''اپنے بابا کو بھیجوں''؟

''چل بھاگ جاتے ہیں؟'' بن ہر بار ایک نیا فقرہ پھینکتا۔

''کیوں؟ اپنے بابا کو بھیجتا کیوں نہیں رے؟...... خالی بڑ بڑ کرتا ہے۔ میرے بابا سے ڈرتا ہے کیا؟''

''نہیں، تیرے بابا سے نہیں......''

''تو؟''

''اپنی ماں سے......!''

''تو جانا گھر اپنے! مجھ سے کیوں پوچھتا ہے؟......شادی کرے گی کیا میرے سے؟ ہونہہ!! اپنی ماں سے پوچھنا!!''

بن کی ماں سر پیٹ لیتی ہے۔

''کیا کمی ہے اس میں؟ لنگڑی ہے کہ اندھی کانی؟''، بن چڑ کر کہتا ہے

''وہ بھی چل جائے گی مگر ملتا نہیں۔''

''آئی، تو ملتا سے جلتی ہے کیا؟''

''اب کیا بولوں رے تجھے؟''

ملتا بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح کھیلتی کودتی بڑی ہوئی تھی۔ اسکول جانے کا شوق تینوں ہی بہنوں میں نہیں تھا۔ بھائی نے تو حساب کتاب تک کی پڑھائی کر لی تھی۔ سود پر پیسہ دیتا تھا۔ باپ کسان تھے۔ ایک ایک کر کے دونوں بہنیں جوان ہو گئیں۔ ملتا ویسی ہی رہی۔ کتنے ڈاکٹروں، ویدوں کو بتایا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کسی نے ممبئی کے کسی بڑے زنانہ بیماریوں کے ڈاکٹر کا نام سجھایا، مگر شہر جا کر علاج کیسے کرائیں۔ وہاں کوئی ایسا بھی تو نہیں،

جس کے پاس جا کر کچھ دن رہ سکیں۔ بات دھری رہی۔ دوائیوں کا فائدہ تو نہیں ہوا لیکن ہاں، ملتا کا جسم ضرور پھول گیا تھا۔ وہ عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ چھوٹی بہنیں ایک کے بعد دوسری سولہ سال کی ہوئیں اور بیاہ کر کے بدا کر دی گئیں۔

لڑکوں کی ماؤں نے انہیں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ملتا کو نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ مگر نظروں پر کسی کا بس چلا ہے؟ ان کی اپنی نظریں بھی اُس پر تھیں، دولت مند گھرانے کی لڑکی جو تھی، بہت ملے گا۔ ہن کی ماں کو بھی یہی لالچ ملتا کی ماں کے پاس لے گئی۔ مگر شانتا تائی نے سمجھا کر بھیج دیا۔

''بعد میں دکھ اٹھانے سے اچھا ہے، شادی ہی نہ کریں۔ لڑکی ہم پر بوجھ نہیں ہے۔''

کیسی چہکتی تھی ملتا بچپن میں۔ سب بہنوں سے تیز تھی، وہ باپ کی لاڈلی! اب وہ ایک طرح سے خوش تھا کہ بیٹی اس کے پاس رہے گی۔ بیٹے کا کیا ہے بیاہ تک اپنا! مگر کبھی کبھی اس کا دل بھی کچوکے لگاتا۔

''کاش سب کچھ ٹھیک ہوتا......!''

چھوٹی بہنوں کی شادیوں کے بعد سے ملتا کچھ بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھابی آ چکی تھیں۔ سبھی کے تین چار بچے تھے۔

بھابی کے ساتھ کچن میں چخ چخ رہنے لگی تو ماں نے کہا۔ ''تو گائے بھینس دیکھ لے۔''

ملتا بڑی صفائی پسند تھی۔ اپنے ہاتھوں سے طویلے کی صفائی کرتی، گائے بھینسوں کو نہلاتی، انہیں چارہ دیتی، دودھ دوہتی۔ اسے پانی بہت اچھا لگتا تھا۔ بار بار ہاتھ صاف کرتی، اپنے برتن خود دھو کر رکھتی۔ گیہوں جوار وغیرہ صاف کرتی۔ مگر چولہے کے پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ جلدی جلدی وِلی (پاؤں درانتی) پر سبزیاں کاٹ کر رکھ جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے برتنوں کے ساتھ ساتھ سارے برتن دھو ڈالتی۔ لیکن جب موڈ نہیں ہوتا تو، کہنے پر بھی کہہ دیتی ''نہیں کروں گی۔''

مکتا کی تین سہیلیاں بن بیاہی تھیں۔ فرصت میں ان سے گپیں لڑاتی، مگر شیلا، پھر مایا پھر ریکھا۔ تینوں سہیلیاں مشکل سے ہی سہی، بیاہ دی گئیں۔ اور کچھ دنوں میں اپنی گرہستیوں میں کچھ ایسی الجھیں کہ ملنا ملانا تک مشکل ہوگیا۔ مکتا کو چپی لگ گئی۔ 'اجّی' یعنی دادی کے پاس بیٹھی رہتی۔ گائے بھینسوں کا کام بھی چھوڑ دیا۔ کھانا لگ جاتا تو دادی کے ساتھ رسوئی میں آجاتی اور دادی کی طرح ہی سیدھے ہانڈیوں سے برتن میں کھانا لے کر بیٹھتی، دوبارہ نہ لیتی۔ بھابھی ناراضگی سے دیکھتیں کہ کھانا بنانے میں تو نہیں آئی لیکن پروسنے بھی نہیں دیتی، خود لے گی ہونہہ! 'دادی ساس' کے ڈر سے وہ کچھ بولتی نہیں تھی۔ پھر اسے بھی اس کی عادت ہوگئی۔ کھانے کے بعد دادی مکتا کو لے کر چلی جاتیں۔

ماں مٹی کے چولہے پر پانی گرم کرتیں، کپڑے حمام میں لگاتیں اور آواز لگاتیں۔

''مکتا......''

مکتا آتی اور گرم پانی کی بالٹی اٹھا کر حمام میں چلی جاتی۔ عمر کے ساتھ ساتھ مکتا میں ایک خاص قسم کی ضد آگئی تھی۔ یا پھر اکیلے پن کی خواہش! دادی کی موت کے بعد تو وہ تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ بس دہلیز پر بیٹھی دروازے کی طرف دیکھ کر خود سے باتیں کرتی رہتی۔ کوئی بات بار بار بڑبڑاتی اور پھر اپنے آپ سے کہتی۔

''چپ بیٹھ، تھپڑ ماروں کیا؟''

وہ دن میں کبھی نہ سوتی۔ بیٹھی رہتی یا گھر میں گھومتی رہتی۔ کھانا بھی وہ ذرا سا کھانے لگی تھی۔ گھر میں سبزی آتی تو صاف کرنے ضرور بیٹھ جاتی۔ بہنیں مائیکے لوٹتے ہوئے اس کے پیر پڑتیں، تو کہتی:

''مجھے پونا آنا ہے''۔

''چلو نا ماؤسی!'' بھانجے بھانجی بلاتے۔

''نہیں، بعد میں۔''، وہ ڈر جاتی۔

کسی کی شادی میں یا کسی کاج میں زبردستی لے جاتے تو گھبراتی۔

''یہاں کیوں آئے؟'' گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتی تھی۔ بھیڑ میں ہاتھ کس کر پکڑ لیتی۔ وہ اپنی کسی پسند کا اظہار نہ کرتی۔

سویرے کے نو بجے ہوں گے۔ بھابی الگنی پر کپڑے سکھا کر تہہ کر کے لائی اور ماں نے ملکا کے لیے حمام میں کپڑے لگا کر آواز دی کہ وہ آکر نہانے کا گرم پانی لے جائے۔

''میرے کپڑے مُڑا دیے، میں نہیں نہاؤں گی...... کپڑے مُڑا دیے...... میرے کپڑے......''

ملکا نے ہمیشہ کی طرح حمام میں گرم پانی رکھا تھا، کپڑے دیکھے تھے اور چلانے لگی تھی۔ ماں دوڑی آئیں۔

''کپڑے مڑا دیے...... میرے کپڑے......''

''آہستہ بول ؤنی (بھابھی) کو برا لگے گا۔ بیچاری سارا دن کھٹتی ہے۔''

''میرے کپڑے......''

''چپ کر بیٹا...... چپ کر، ؤنی کو......''

شاید بھابی نے سن لیا تھا۔ اس کے بعد ملکا مقررہ وقت پر بھابی کے ہاتھ کے دھلے کپڑے جھٹک کر ڈالتی اور سوکھتے ہی اچھی طرح تہہ کر کے رکھ لیتی۔

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برس گزر گئے۔ آج بھائی ہون راؤ کی بڑی بیٹی کے لیے رشتے والے آنے والے تھے۔ ماں بہو کی مدد کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں۔ شاید بیٹی کی بھرپائی کرتی تھیں۔ ملکا کی دادی کے مرنے کے بعد وہ کسی بھی کام میں کیوں نہ ہوں، درمیان میں ملکا کے پاس ضرور جا بیٹھتیں...... آج ماں نے سمجھا بجھا کر ملکا کو اندر، اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ناشتہ لگانے میں مدد کی۔ کچھ دیر لڑکے والوں کے ساتھ بیٹھ کر، پوتی کو ان کے پاس بٹھایا اور بیٹی کے کمرے میں آ گئیں...... ملکا آئینے میں اپنا چہرہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ماں نے اسے دھیان سے دیکھا۔ اس نے اپنے سارے گہنے پہنے ہوئے تھے اور اپنی بھابی کی شادی کا گھونگھٹ سر پر اوڑھے ہوئے تھی۔ مانگ کی جگہ پر ایک چھوٹا سا سفید گھنگھرالے بالوں کا گچھا بندیا کی طرح جھول رہا تھا۔ ماں چپ چاپ پلٹ گئیں۔

کمرے کے دروازے کے باہر آ کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں، پیر کانپنے لگے، لگا گر پڑیں گی۔زمین پر بیٹھ گئیں۔

''ساسو ماں!'' بہو ڈھونڈتی ہوئی آئی، ''کیا ہوا؟......اُہو!......سنو......دیکھوتو کیا ہوا آئی کو......'' ادھر سے ہون راؤ، اُدھر سے مکتا ماں کے پاس دوڑے آئے۔ماں نے مکتا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔وہ ویسی ہی سیدھی سادی چھ گز کی عام عورتوں کے پہننے والی شوخ گلابی رنگ کی پھولوں والی ساڑی میں لپٹی تھی۔بدن پر زیور تھا نہ گھونگھٹ۔پھر وہ سچ تھا کہ خیال!......ان کی کپکپی زور پکڑ رہی تھی۔

''جا کھانا کھا کر آ''، اس حالت میں بھی ماں کو سرہانے بیٹھی ٹکٹکی لگائے اپنے کو دیکھ رہی مکتا کی فکر تھی، لیکن اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر پانچ بجے آئے گا، شہر گیا ہے۔'' ہون راؤ دوڑ کر پتہ کر آیا، ''ایک گھنٹہ ہے۔''

''ساسو بائی، خود کو سنبھالیے۔'' بہو نے ان کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

''تو نے کھایا سون بائی؟'' انہوں نے بہو کو پوچھا۔

''ہاں ساسو ماں'' بہو نے مکتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اِس کا من ٹھیک نہیں۔ٹھیک لگے گا تو لے لے گی......ہو سکے تو بیٹی کے ہاتھ سے اِسے دودھ بھجوا دو۔'' مکتا نے انکار میں سر ہلایا، تو بولیں، ''ٹھیک ہے۔نہیں لائے گی......تُو گھبرا مت......میں تیرے مرنے کے بعد ہی مروں گی۔'' بستر پر پڑی تیز بخار میں وہ بڑبڑا رہی تھیں......ان کی حالت دیکھ کر سب رو رہے تھے۔

ماں ٹھیک ہو گئیں مگر ان کے پیر اکڑ گئے۔کھڑی نہیں ہو پاتی تھیں۔گھر بھر میں گھسٹتی پھرتیں۔لیکن بہو کی مدد کرنے میں بیٹھے بیٹھے جو کر سکتیں، کرتیں۔پیروں کی مجبوری کم ہی آڑے آتی۔بہو بہت کہتی۔

''بیٹی مدد کر دے گی۔''

''نہیں، پڑھنے دو میری پوتی کو۔اس کی شادی کے دن دور نہیں۔'' وہ بڑے پیار سے کہتیں اور بہو مسکرا دیتی۔ماں بوڑھی ہو گئی تھیں۔بابا بھی لکڑی ٹیکتے تھے۔کھیت پر کم

جاتے۔ مزدور، کسان گھر آ کر آنگن میں بیٹھتے۔ حساب دیتے، گپیں لڑاتے۔

ماں کتنی بار بیمار ہوئیں اس کی گنتی کیا! ہر بار اٹھ بیٹھتیں۔ ہر بار کہتیں۔

''مکتا کو چھوڑ کر نہیں مر سکتی۔''

کچھ دنوں سے مکتا نے بھی ہانڈیوں سے کھانا لینا چھوڑ دیا تھا۔ بس چمچ بھر چاول اور دال لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ کھانا کھا کر اپنے برتن دھو کر کونے میں رکھ دیتی۔ صرف دوپہر میں کھانے لگی تھی۔ رات میں ماں گھسٹتی ہوئی آتیں اور دودھ پلا جاتیں۔ گدرایا بدن دھیرے دھیرے ہڈیوں کا ہار دکھائی دینے لگا۔

مکتا اب دو دنوں میں ایک بار کھانا کھانے لگی تھی۔ اس کے باقی روزمرہ کے کام برقرار تھے۔ صبح کے کاموں سے نپٹ کر وہ اپنی پسندیدہ دہلیز پر جا بیٹھتی۔

آج ببن نے مکتا کو پچیس سال بعد دیکھا تھا۔

ویسی ہی، بالکل ویسی ہی سندر اور معصوم۔ لال پھولوں کی ساڑی، سونے کی چوڑیاں، گلے میں چین، کانوں میں موتی کے پھول۔

''پہچانا؟...... میں ببن ...... پڑھائی کے لیے امریکہ گیا تھا نہ، وہیں بس گیا تھا۔ پچیس سال بعد آیا ہوں...... تم تو بالکل ویسی ہی ہو''، اس نے اپنی خوشی بھری ہنسی دبائی۔ مکتا نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھیں مسکرائیں، پھر شانت اور انجان ہو گئیں۔ وہ اپنی ساڑی کے پلو میں چھپا کر اپنی انگلیاں گننے لگی۔ ببن وہیں رک کر اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ سر کھجانے لگی۔

''پتنی بھی آئی ہے۔ کل لاؤں گا ملانے۔''

''چل ہٹ''، مکتا نے پاس پڑا اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر پھینکا۔ ببن کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔

''سالی......! آئی ایم ساری۔ آئی ایم ساری......''

''معاف کر بیٹا، یہ باؤلی ہوئی ہے، تو برا مت ماننا۔'' مکتا کی ماں گھسٹتی ہوئی آئیں۔

''اندر آ جا پٹی کرتی ہوں۔ ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔''

''کاکی آپ کے پیروں کو کیا ہوا؟''، انہیں گھسٹتے دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔مگر پھر اچانک پیشانی کی چوٹ سے بہتے خون اور شرمندگی کا خیال آیا اور — ''کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔'' کہتا ہوا جواب سنے بغیر ہی ہن وہاں سے چلا گیا۔

شام گہرا گئی تھی۔ مکتا کی ماں سرہانے بیٹھی اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ صبح سے وہ کچھ بولی نہ ہلی ڈلی۔ کئی دنوں سے اس کا کھانا بند تھا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر بولیں۔

''ہون راؤ دیکھ تو، دیدی ٹھیک تو ہے؟''

''آئی! دیدی تو ٹھنڈی ہو گئی''، ہون راؤ ناڑی دیکھ کر بولا۔

''جا بابا کو بتا دے''، انہوں نے اتنی شانتی اور بغیر کسی تناؤ کے ہون راؤ سے کہا تو وہ تڑپ کر ماں کے گلے لگ گیا۔

مکتا کو مرے آج تیرہ دن ہوئے تھے۔ پورا گاؤں کھانا کھا کر گیا تھا۔ ماں بخار سے تپ رہی تھیں پھر بھی ہاتھ میں جھاڑو لیے صفائی کر رہی تھیں۔ بہو ہاتھ سے جھاڑو لینے لگی تو پیار سے ڈانٹا۔

''کیا سکھ اٹھایا تو نے بھی! یم بلاتے تھے مگر تجھ پر بوجھ نہیں ڈالنا تھا نہ، اس لیے میں نہیں گئی''انہوں نے ہنس کر بہو کو گلے لگا لیا۔

اگلی صبح گاؤں والوں کو پھر اسی گھر میں جمع ہونا پڑا۔

مکتا کی ماں نہیں رہی تھیں۔

ہن پنڈھر پور کی یاترا کے لیے لکڑی کی دنڈی (پالکی) میں وٹھل کی مورتی کو سجا رہا تھا۔

''تُو، تو اسے پسند کرتا تھا لیکن مکتا تو تیرے سے پیار کرتی تھی۔''

''کیسے معلوم؟؟؟''، ہن نے سوچا' آج ماں کو کیا ہو گیا ہے!'

''وہ بولی تھی میرے کو، ایک بار...... اپنے کھیت میں آئی تھی پوچھنے کو کہ......''

''کہ؟''، ہن راؤ کی بے چینی ماں سے چھپی نہیں رہی۔

''کہ میرا کیا دوش ہے؟؟''

''پھر؟''

''میں بولی پورے رشتہ داروں کو معلوم ہے تجھے ماہواری نہیں آئی۔ کتنی جڑی بوٹیاں ہضم کرگئی۔''

''اب اس میں میرا کیا دوش!!''

''پھر!!!'' بہن نے پوچھا۔

''وہ پلٹ کر جانے لگی تھی تو میں نے اسے روکا اور بولی۔

''سن بیٹا، کسی کو معلوم نہیں ہوتا یا ہم دوسرے گاؤں کے ہوتے تو اور بات تھی۔ اب لوگ پوچھیں گے نہ کہ تیرے بیٹے میں کیا دوش تھا کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی۔''

ممبئی سے پنڈھر پور پور جانے والی ٹولیاں لیزم بجاتی نرم سخت دھوپ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سر پر پھینٹا باندھے، لکڑی کی ڈنڈی میں وٹھل کی مورتی کو لیے پندرہ دنوں کی جترا میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ پونے، بارامتی، اندا پور روڈ کے راستے سے یہ ٹولی شولہ پور روڈ چھوڑ کر پُونے ضلعے کے آخری گاؤں باوڑہ کے لیے بڑھی ہے۔ ہر سال بہن کی ماں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ آشاڑھ اور کارتک کے مہینوں میں وٹھل رکمائی (کرشن رکمنی) کے درشن کرنے پیدل جاتی ہیں۔ اس بار فرق صرف اتنا تھا کہ باوڑہ میں امریکہ رٹرنڈ بہن راؤ اپنی آئی اور بیوی کی ضد پر انہیں لیے ٹولی کے ساتھ شامل ہونے کو کھڑا تھا۔ کچھ لوگ سر پر پینے کے پانی کی کلسیاں اور تلسی کا پودا بڑی عقیدت سے اٹھائے ہوئے تھے۔

''اگلی بار تبھی آؤں گی جب میری منوتی پوری ہوگی۔'' بہن کی آئی اپنی بہو کے لیے منت کرنا چاہتی تھیں، ''ہے وٹھل پانڈورنگ! میری سون کی گود بھر دے۔''، اپنے سر پر گملے میں تلسی کا پودا اٹھائے انہوں نے شردھا سے کہا تھا اور وہ، ''ہری وٹھل، ہری وٹھل، ہری وٹھلا'' کا جاپ کرنے لگ گئیں۔

☆☆

ٹی شرٹ

سالانہ جلسہ اس سال ''شری رنگ بھون'' میں رکھا گیا تھا کیونکہ کالج کا آڈیٹوریم چار ہزار طلبا کے لئے ناکافی تھا۔ شام چار بجے تقریباً آدھا درجن بجی سجائی، ساڑیوں میں ملبوس لڑکیاں پوجا کی تھالی میں ننھا سا دیا لئے کھڑی تھیں۔ انہیں مہمانانِ خصوصی کے آتے ہی ان کی آرتی اتار کر، تھالی میں رکھی ہلدی اور کم کم لگانا تھا۔ آئے ہوئے مہمان کچھ روپے تھالی میں رکھ دیتے۔ فوٹوگرافر کو کھٹا کھٹ تصویریں نکالنی تھیں۔ وہیں نادرہ نے لڑکیوں کے پیچھے اس عجیب لکھاوٹ والی ٹی شرٹ کو دیکھا۔

''تمہیں پتہ ہے یہاں کیا لکھا ہے؟''

''ہاں'' ٹی شرٹ میں سے وہ بے شرمی سے بولا۔

''کیا لکھا ہے بتاؤ تو!''

''آج کل تو ٹی وی پر ایڈورٹائز کرتے ہیں'' وہ جواب بچا گیا، بوکھلا کر بولا ''یہ تو اچھی بات ہے نا؟۔۔۔۔۔ایک طرح سے میں سرکار کی مدد ہی کر رہا ہوں۔''

''ٹی وی کی بات اور ہے۔''

''آپ کو یہاں موجود لڑکیاں دکھائی نہیں دیتیں؟'' وہ ذرا سا چڑ گیا تھا،'' کیسے کیسے کپڑے پہنتی ہیں! بتاؤں؟''

ہاں بتاؤ تو! مجھے تو کوئی قابل اعتراض حالت میں نظر نہیں آتی۔''

''بتاؤں!۔۔۔۔ابھی بلا کر بتا سکتا ہوں۔'' وہ جوش میں آگیا۔

''بالکل بتاؤ''۔ نادرہ نے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''جانے دیجئے بیکار میں برا مان جائیں گی۔ دوست ہیں۔'' وہ اپنے جوش کو قابو میں کرتے ہوئے بولا ''مگر ہاں! ایسی ٹی شرٹ صرف میں ہی نہیں پہنے ہوں۔ اور بھی ہیں۔۔۔۔۔ ہمارے پورے گروپ نے پہن رکھی ہے۔

۔۔۔۔۔ان سے تو آپ کچھ کہتی نہیں۔''

''مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا۔''

''ویسے میں اِس کالج کا نہیں ہوں۔ ممبئی یونیورسٹی میں مینیجمینٹ کا اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''ابھی ہمارا علاقہ Pollute نہیں ہوا ہے۔''

''کیا بات کرتی ہیں؟ کتنے لڑکے لڑکیاں، کیا کیا کرتے ہیں، آپ کو پتہ نہیں کیا؟''

''جو چھپ کر کرتے ہیں، ان پر ہمارا بس نہیں۔ ان کو کیسے روکیں؟۔۔۔۔۔ پھر تم تو کھلے عام کر رہے ہو۔ یعنی برائی کو عام کر رہے ہو۔۔ آج کل تو۔۔۔۔'' نادرہ زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتی تھی، بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی اور اسٹاف کے لئے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بی اے کے دوسرے سال کی لڑکیاں لاونی اچھی کر رہی تھیں۔ خوبصورت مہاراشٹری نوواری کاشٹا ساڑی میں وہ غضب ڈھا رہی تھیں۔

''ڈھولکی چا تالا وَر، گھنگھرانچا بولا وَر

می ناچتے، می ڈولتے،

عشقاچہ دربارات''

نادرہ نے محسوس کیا کہ سچ مچ ڈھولکی کی تال پر گھنگھروؤں کے بول عشق کے دربار میں گونج اٹھے ہوں۔

رقص ختم ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا کہ اِتنے میں وائبریٹر پر رکھا ہوا فون تھر تھرانے لگا۔ شور و غل سے نکل کر فون اٹھانے کے لئے نادرہ نیچے آئی تو دیکھا وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر نادرہ کا جی پھر سلگ اٹھا

''جوزف ڈی میلو''

''تمہاری ماں نے دیکھی ہے یہ شرٹ؟''

''ہاں۔''

''کچھ بولی نہیں؟''

''کیوں بولیں گی''۔

''پڑھنا آتا ہے انہیں؟''

''کیا میڈم! آپ تو الزام لگائے جا رہی ہیں۔''

اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''اس میں الزام کی کیا بات ہے؟ بہت سے ماں باپ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔''، نادرہ پلٹی اور موبائیل فون لگانے لگی۔تو پیچھے سے اس نے آواز دی۔

''آپ کے بیٹے کا نام روشن ہے نا؟''

واقعے کے اس موڑ کے لئے وہ تیار نہیں تھی۔آخر روشن کیوں آ گیا یہاں!، نادرہ نے سوچا۔

''ہاں۔''

''وہ میرا دوست ہے۔'' وہ یک لخت نرم پڑ گئی۔

''چھٹیوں میں روشن میرے بھائی کی کلاس میں گٹار سیکھنے جاتا تھا۔''

نادرہ نے سوچا، اس سے پہلے کہ جوزف یا اس کا میوزک ٹیچر بھائی توڑ مروڑ کر اپنے انداز میں یہ واقعہ روشن کو بتائے،۔۔میں ہی اسے بتا دوں۔کوئی غلط فہمی ہمارے رشتے میں نہ پیدا ہو جائے۔

''آج گیدرنگ میں ایک لڑکا عجیب سی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا''۔

''ہیوا سیف سیکس نا!۔۔۔آپ نے اسے بھاشن تو نہیں دے دیا؟''،

روشن نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں ٹوکا تو، تبھی تو اس نے اپنا نام بتایا۔۔۔ جوزف ڈی میلو!'' روشن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی، اسے ٹوکنے کی؟'' ایک سکنڈ کا وقفہ لے کر اس نے ماں سے سوال کیا۔ پھر جواب بھی جیسے خود اسی نے دیا ''آج کل تو ٹی وی پر اشتہار دکھاتے ہیں!''

''تم بھی وہی کہہ رہے ہو، جو وہ کہہ رہا تھا۔'' نادرہ کو بیٹے سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔

''ٹھیک تو ہے۔۔۔''

''کیا ٹھیک تو ہے؟''

''اب میرے دوست میری ہنسی اڑائیں گے۔ آپ نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔'' وہ اپنی رو میں کہتا گیا۔

ہال سے کچن کی طرف جاتے ہوئے نادرہ نے احساس کیا۔'اب میرے طلبا'' صرف میرے طلبا نہیں رہ گئے۔ بیٹے کی عمر کے ہو گئے ہیں۔۔۔ میں نے غلطی تو نہیں کی جوزف کو ٹوک کر؟'، وہ خود سے سوال کرتے ہوئے ہال اور کچن کی درمیانی سرونگ ونڈو سے ہال میں کھڑے ہوئے بیٹے کا منہ تکنے لگی۔

''آپ کو کیا کرنا ہے ان کے پہناوے سے؟....آپ کا جاب تو صرف پڑھانا ہے۔ میں بھی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر کچھ نہیں بولتے!''

''میں تو سمجھی تھی۔ تم تو کم سے کم ایسے نہیں ٹوکو گے۔ تم تو ایسے کپڑے نہیں پہنتے نا؟''

''پہن تو سکتا ہوں، مگر پہنتا اس لئے نہیں کہ میرے گھر والوں کو پسند نہیں ہوگا...

چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے آپ کے سٹوڈنٹس کو ایکسپوژر نہیں ملتا۔ وہی حال آپ کا بھی ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔ نئے زمانے کے سٹوڈنٹس کیسے ہوتے ہیں۔.....اور ہمارے پروفیسر!.....بولتے تو کیا! ارے وہ تو لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ بھی پیتے ہیں،

ڈرنکس بھی لیتے ہیں۔'' وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

نادرہ دھیرے سے ہال میں لوٹ آئی۔ بیٹے کے بہت قریب آ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی، ''ٹھیک ہے بیٹا...''

☆☆

نوٹس

اس دن کالج میں فرینڈ شپ ڈے کی دھوم مچی تھی۔ آرکسٹرا کا شور اودھم مچاتے طلباء.... اسٹاف کو افتتاحی جلسے کے لیے کمیونٹی ہال میں جانا تھا۔ اور دو دو جملے نیک خواہشات کے سنا کر فرینڈ شپ بینڈ بندھوا کر لوٹ آنا تھا۔

اسٹاف روم میں طلباء کے بھیجے ہوئے سموسوں اور ٹی کلب کی چائے کا مزہ لے کر اسٹاف ادھر ادھر بکھر گیا۔ کچھ کینٹین چلے گئے۔ کچھ لائبریری، کچھ آفس اور اکا دکا چپکے سے نکل گئے۔ تیز بارش کے ٹھنڈے ٹھنڈے سہانے موسم میں گھر جلدی جا کر لحاف میں دبک کر ٹی وی دیکھنے کا مزہ کبھی کبھی ہی تو ملتا ہے۔ پروفیسر ساہنی کاریڈور میں کھڑی تیز بارش اور دودھیا جھرنوں کو نہار رہی تھیں کہ ایک نازک سی لڑکی نے پیچھے سے آواز دی۔

''میڈم مجھے نوٹس ملیں گی؟''

''کیا نام ہے تمہارا؟''، انہوں نے بغیر پلٹے پوچھا

''مینا!۔ یاد نہیں میرے کزن یوگیش نے میرا آپ سے پریچئے کروایا تھا۔''

''یوگیش آں؟؟! یاد آیا۔ وہ قطر جانے والا تھا نا! چلا گیا؟''

''ہاں نوکو، ہی چلا گیا۔ میں جاب کرتی ہوں۔ اس لئے کالج نہیں آسکتی۔''

''کون سے نوٹس چاہئیں؟''

''ایف وائی بی اے سوشیالوجی کے...... جو آپ کلاس میں دیتی ہیں''

''وہ تو کسی اسٹوڈنٹ سے ہی ملیں گی......''

''ہاں وہ تو ہے۔''، وہ ناامیدسی ہوگئی۔

''کہاں رہتی ہو؟''

''کشیلے''

''وہ کہاں ہے؟''

''کرجت سے کوئی سولہ سترہ کلو میٹر پیچھے بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں جنگل ہی جنگل ہیں۔''

''پھر تمہیں کون اپنی نوٹ بک دے گا؟ پرسوں سوشیالوجی کا لیکچر ہے، پھر وہ کہاں لکھے گا؟''

''میں پرسوں نوٹ بک لوٹا دوں گی۔''

''مشکل ہے...... تم پر اتنا وشواس تو ہو!...... چاہو تو کچھ لڑکیوں سے دوستی کروادوں یا پھر میرے پاس پچھلے سال کی لکھی گئی نوٹ بک پڑی ہوں شائد میں وہ دے سکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مینا مطمئن ہوتی دکھائی دی۔

''کیا جاب کرتی ہو؟''، پروفیسر ساہنی نے یوں ہی پوچھ لیا

''ٹیچر ہوں۔ کشیلے کے آدرش ہائی اسکول میں انگلش میڈیم کی۔''

''انگلش بولنی آتی ہے؟''

''تھوڑی تھوڑی...... مگر لوور کے.جی، ہائیر کے.جی کو پڑھا لیتی ہوں....''

''پوئٹری، کلر، پھل، پھول، گاڑیوں کے نام......''

پروفیسر کو انگلش میڈیم کے بچوں پر ترس آیا، ''کیا تنخواہ ہے؟''

''ایک ہزار روپۓ''

''ایک ہزار روپۓ کے لیے پڑھائی خراب کرتی ہو! ساڑھے گیارہ بجے تک ہی تو لیکچرس ہوتے ہیں۔ انہیں اٹینڈ کیۓ بغیر کیا سیکھو گی؟''، پروفیسر ساہنی نے رک کر کہا۔

''وہ کیا ہے کہ میری دوسری ماں بھی ہے۔''، شاید وہ موضوع گھما دینا چاہتی تھی۔

''ساتھ رہتی ہیں؟''، پروفیسر ساہنی بھی بہہ گئیں۔

''رہتی تھی...لیکن ایک دن میں نے اسے مارا۔تب سے نہیں رہتی۔''

''تم نے اسے کیوں مارا؟''، پروفیسر ساہنی نے سر سے پیر تک غور سے اس کا جائزہ لیا۔ نیلی پیلی پھولدار سوتی شلوار قمیص، گلے میں پڑے نیلے رنگ کے دوپٹے، سلیقے سے کندھوں تک کٹے بال، گوری پیشانی پر چمکیلی سنہری نیلی بندی، پنسل ہیل کے سینڈل، بغیر کسی زیور کے بھی وہ سجی سجائی نظر آرہی تھی۔ بھولپن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ جیسے ابھی کوئی چھیڑے گا تو رو ہی تو پڑے گی...... 'یہ کیا کسی کو مار سکتی ہے!'، انہوں نے سوچا۔

کیوں مارا؟''، پروفیسر نے دوبارہ پوچھا

''وہ دادی اور ماں کو گالی دے رہی تھی۔اس کے منہ میں ننگی ننگی گالیاں ہیں''

پروفیسر ساہنی مینا کا منہ دیکھنے لگیں۔''آپ کو معلوم نہیں میڈم! اس نے اپنے پہلے پتی کو نالے میں ڈھکیل کر مارا تھا...... پہلے پتی سے اس کی ایک لڑکی بھی ہے۔ جو چل نہیں سکتی۔ اور جسے اس نے اپنی ماں کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔''، مینا نے اپنی بات جاری رکھی،''...... پہلے وہ بلڈنگ کنسٹرکشن میں گھمیلے اٹھانے کا کام کرتی تھی......مگر وہ جھونپڑے میں نہیں رہتی تھی۔اس کا گھر اچھا اور پکا تھا۔''

''پھر!!!''، مینا کی بے ربط باتوں کے باوجود پروفیسر ساہنی کو اس کی سوتیلی ماں میں دلچسپی جگی۔

''...لیکن ہمارے پاپا کے کشیلے کے علاوہ کرجت ...... اور کڑواؤ میں بھی گھر ہیں۔''، مینا اپنی دھن میں کہتی گئی۔''پاپا نے جلدی جلدی میری دو بہنوں کی شادی کردی کیوں کہ وہ ان دونوں سے بہت گھبراتے تھے کہ ماں کی طرف داری کریں گی۔''

میری بھی کرنا چاہتے تھے۔لیکن میں نے کہہ دیا کہ مجھے گریجوئیشن کرنا ہے۔

''یہ تو بہت اچھا کیا تم نے......''، پروفیسر ساہنی اس کی بات سے خوش ہوئیں، ''ورنہ ہماری لڑکیاں تو......''

''ہاں میڈم...... جس دن بارہویں کا ہسٹری کا پیپر ہوا لڑکے والے مجھے

دیکھنے آئے تھے۔''۔ میڈم کی تعریف سے مینا بھی جوش میں آ گئی۔ چہک کر بولی، ''مگر میں نو بجے ہی گھر سے نکل گئی۔ گھر میں سب کو پتہ تھا، بس مجھے ہی معلوم نہیں تھا اس بارے میں......''

ارے ایسے کیسے!''

''ہاں میڈم! پاپا کا فون آیا، 'مینا کو دیکھنے وہ دس بجے آنے والے ہیں'۔ میں سمجھ گئی وہ ممی سمجھ کر مجھے بول گئے تھے۔ اس دن میرا پیپر کر جت کے اکھنیو ہائی اسکول میں تین بجے تھا۔ مگر میں صبح ۹ بجے ہی گھر سے بھاگ گئی......''

''او...وہوشیار ہو......''، پروفیسر ساہنی مسکرائیں۔ تبھی دو لڑکیاں انہیں گڈ مارننگ کہہ کر نکل گئیں۔ انہوں نے بھی مسکرا کر اور گردن ہلا کر لڑکیوں کے سلام کا جواب دیا۔

......نہیں تو کیا......میرے پاپا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں......مگر جب میں دو دنوں کی چھٹی مان گاؤں...اپنی دوسری بہن کے گھر گزار کر لوٹی تو پتہ چلا، میرے پیچھے ڈیڈی کورٹ میں شادی کر کے اسے گھر لے آئے تھے۔''، مینا کے چہرے پر افسردگی لہرانے لگی۔ جو پروفیسر ساہنی کو چھو گئی۔

''کیا ان کی پہلی شادی رجسٹر نہیں ہوئی تھی؟''

وہ تو منڈپ میں ہوئی تھی نا! پھیرے ویرے......آپ جانتی ہیں نا!''

''تمہاری دوسری بہنیں کیا بولیں؟''

''کچھ نہیں۔ ہمارے پاپا بہت ڈینجر ہیں نا!....بہت خوف آتا ہے! ہمیں اُن سے۔ بچپن سے ہی ہمیں باہر جانے نہیں دیتے۔ لڑکوں کو ہم سے بولنے کی ہمت نہیں......دو نمبر والی بہن کو پتہ چلا تو بڑی کو لے کر پہنچ گئی۔ پتہ نہیں اس میں کیسی ہمت آ گئی۔ اسے بہت پیٹا، کہنے لگی۔''......'میرے کو چھوڑ دو۔ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا'، وہ دیدی کے پیر پکڑ کر کہنے لگی تھی، 'میں پیٹ سے تھی......تمہارے پاپا سے......''، مینا نے بھوئیں اچکا کر کہا۔

''تمہارے پاپا وہاں نہیں تھے......؟''

''پاپا سامنے تھے مگر کچھ بولے نہیں......شرمندہ ہوں گے۔ میری دو نمبر کی بہن

پاپا کی طرح ہی ڈینجر ہے نا! اور پھر ہمارے پاپا کی طرف سے ہے ہی کون ...... وہ اکیلے ہیں۔ ان کے پتا گزر چکے ہیں اور کوئی بھائی بھی نہیں ہے نا...... صرف دو بہنیں ہیں ...... ویسے بھی اس دن دیدی پر غصہ کا بھوت سوار تھا۔''

''تم لوگوں نے اسے چھوڑ دیا؟''

''ہاں چھوڑ دیا...... بلکہ گھر پر رکھا...... کیوں کہ کورٹ میریج کی تھی نا! باہر نکالنا بری بات ہوتی نا! وہ گر بھوتی تھی نا! وہ بھی ہمارا بھائی یا بہن ہوتا نا!''

''پھر کیا ہوا بہن یا بھائی؟''

''بہنیں ...... اب دو ہوگئی ہیں۔ ہمارے گھر کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے اس لیے ہم ان کو بہت لاڈ کرتے ہیں۔''

''تمہاری ماں پڑھی لکھی ہیں؟''

''میری ماں کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ اُس کو تھوڑا آتا ہے۔''

''اسے ممی بولتے ہو؟''

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا... لیکن اب وہ اچھی ہوگئی ہے۔ پہلے سائٹ کے اور آزو بازو والوں کے بھڑ کانے سے گالی دیتی تھی، اب سب ٹھیک ہے۔''

''تمہارے پاپا دیکھنے میں کیسے ہیں؟''

''بہت موٹے کالے ...... پینتالیس سال کے ہوں گے مگر بہت جوان دکھائی دیتے ہیں۔ پاپا کی بڑی عزت ہے ہمارے علاقے میں ...... کانگریس ضلع ادھیکش (صدر) ہیں وہ۔''

''اور ممی؟''

''میری ممی بہت سندر ہیں۔ میری بہنیں بھی بہت سندر ہیں۔.....میری ممی میرے پاپا کے ماما کی بیٹی ہیں۔ پاپا کے گھر ہی میں رہتی تھیں۔ دادی کی دیورانی کو بچے نہیں تھے۔ انہوں نے ممی کو پال لیا تھا۔ دیورانی دادی کی بہن ہی تھیں نا!''

''تم لوگ کتنے بھائی بہن ہو؟''

''ممی کے چھ بچے ہیں، پہلے ہم تینوں بہنیں، پھر دو بھائی اور پھر ایک بہن

اتنے بچوں کے باپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''اُس کی ماں کا دارو کا اڈہ ہے اس کی دو نمبر کی بہن اپنی ہلدی کی رسم کے وقت گھر سے بھاگ گئی تھی اور چھوٹی بہن کی، جو میرے ساتھ پڑھتی تھی، جب وہ چودہ سال کی تھی، ایک پیسے والے بوڑھے کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی۔ جس کے دو بڑے بڑے لڑکے تھے اور پہلی عورت مر چکی تھی...... کیوں کہ سب کے ساتھ پھرتی تھی......''

''اچھا؟ یعنی تمہاری دوسری ماں کا پورا خاندان ہی گڑبڑ ہے!''، اتنی الجھنوں کو دیکھ کر پروفیسر ساہنی چکرا گئیں۔ پھر سنبھل کر پوچھا،''خیر۔ پھر وہ تمہارے گھر میں اچھی طرح رہنے لگی؟''

''ہاں! ممی کھانا بناتیں اور وہ کپڑا پانی کا کام کرتی۔''

''کشیلے میں کنویں سے پانی لانا پڑتا ہے؟''

''نہیں بورنگ ہے ہمارے گھر میں ...... صرف ہنڈے بھر کر رکھنے پڑتے ہیں۔''، مینا نے شان سے کہا۔

''پھر تم نے اس کو مارا کب؟''، پروفیسر ساہنی کو یاد آیا۔

''پچھلے سال مئی میں...... اس نے ناشتہ نہیں بنایا تھا اور پاپا نے اس دن اس سے ناشتہ مانگا تھا...... وہ اسے مار رہے تھے۔ گالی دے رہے تھے۔ میں نے چھڑایا تو مجھی کو چلانے لگی کہ 'اِس کو کھانا بنانا نہیں آتا کیا؟ اسکول جاتی ہے اور آتی ہے۔'، پھر ممی اور دادی کو گالیاں دینے لگی۔ 'یہ خالی بیٹھی رہتی ہیں اور سوتی رہتی ہیں۔ مینا کو کوئی کام کیوں نہیں بولتیں؟؟ نالائق...... ہلکٹ......''

''ارے توبہ!...... پھر؟؟''

''تب میں نے اسے مارا...... دونوں گال پر تھپڑ لگائے اور بال کھینچ کر باہر نکال دیا۔ 'آپ بھی یہاں نہیں رہیں گے'، میں نے پاپا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، 'آپ رہیں گے تو یہ بھی رہے گی۔''

پروفیسر سانی جوڑے کا کلپ کھول کر لگانے لگی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے کلپ چھوٹا اور بال نکھر گئے۔ بولیں، ''پاپا کچھ نہیں بولے؟''

''اُن کو میرے جنم کے دن الیکٹرسٹی بورڈ میں نوکری ملی تھی نا! وہ مجھے لکی مانتے ہیں۔ چپ چاپ گاڑی میں اسے بٹھا کر نکل گئے۔ کرجت رہنے لگے...... پیچھے میں بہت بیمار پڑ گئی تھی میرے پاپا مجھ سے بات نہیں کرتے تھے نا۔ گھر آنا بند کر دیا تھا...... تمیس مئی کو تو میں سیریس ہو گئی تھی۔ ممی نے فون کیا تو پاپا اور وہ دونوں لینے آئے۔ اُس نے مجھے کندھے پر ڈال لیا اور گود میں لٹا کر گاڑی میں اسپتال تک لے گئی۔ پاپا اور وہ دونوں اسپتال آتے تھے...... دو دن سرکاری اسپتال میں میرے ساتھ رہی میں سمجھ گئی وہ دل کی اچھی ہے...... کسی نے بھڑکایا ہوگا، تبھی جھگڑی تھی......''

پروفیسر سانی اس کی بات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

''چھ جون کو میں اپنی بوا کے گھر کھپولی میں تھی۔ سات جون کی صبح پاپا نے فون کیا تم بارہویں پاس ہو گئیں۔ جلدی گھر آجاؤ......، ......انہوں نے بہت پیڑے بانٹے۔ مجھے ڈر تھا کہ پاس نہیں ہوؤں گی۔ کیوں کہ امتحان کے دنوں میں ہی جھگڑے ہوتے تھے۔''

''کیسے جھگڑے؟''

''وہ پاپا کو الٹا بولتی تھی۔ وہ اُن دنوں ہمارے گھر میں رہتی تھی۔ وہ کہتے، 'پانی دو۔' یہ کہتی، ''تم جا کر لے لو نا!...میرے سے کیوں مانگ رہے ہو......' اب صبح سے شام تک پاپا اُدھر ہی رہتے ہیں۔ زیادہ بارش ہو تو ہمارے گھر ہی آتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاتے ہیں...... میں بھی کبھی کبھی کرجت جا کر رہتی ہوں۔ اس کی مدد کرتی ہوں...... میں نے مارگ شیش کا ایک مہینہ اُپواس رکھا، تبھی گھر میں شانتی آئی۔ ہر گروار مہالکشمی دیوی کی پوجا کرتی ہوں۔ اور منت مانی ہے کہ شانتی بنی رہے تو ہر سال اپواس کروں گی۔''

''تمہاری ممی کو پتہ ہے کہ تم اس کے گھر میں رکتی ہو؟''

''کھپولی آتی ہوں تو کرجت ضرور رکتی ہوں۔ پہلے ممی کو نہیں بتاتی تھی۔''

''...اور تم اس کو کیا کہہ کر بلاتی ہو؟''

''اس کی بڑی بیٹی کو ہم دیدی کہتے ہیں اور اسے دیدی کی ممی......''

''اور تمہاری ممی کا اس کے ساتھ کیسا ویوہار ہے؟''

''میری ممی بہت سیدھی ہیں۔ اس کا بچے بند کرنے کا آپریشن ہوا تو ممی نے مدد کی۔ اس کے دونوں بچے میری ممی کے پاس ہی زیادہ رہتے ہیں۔ اب ہم اسے گندہ ویوہار کرنے نہیں دیتے۔ وہ ممی کی طرح ہی ساڑی پہنتی ہے۔ ہم اس کو سکھاتے ہیں کہ 'پاپا اتنے بڑے صاحب ہیں، تم ایسے مت رہا کرو'...''

''اب پاپا کا ویوہار کیسا ہے؟''

''کبھی بات نکلتی ہے تو میں ان سے کہتی ہوں۔ آپ کو اپنے کلرک کی بیوی چاہئے تھی، اس لئے کی۔ وہ بھی بھرپور ہنستے ہیں۔''

''گھر میں پیسے دیتے ہیں؟''

''اب ہم کچھ بھی مانگتے ہیں تو لے کر دیتے ہیں۔ گھر میں سامان بھرتے ہیں پیسے دیتے ہیں۔ مگر میں بازو والی کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے نا! اس کا پتی ہر روز اس کے ساتھ رہتا ہے...... میں بیس سال کی ہوں مجھے بھی تو سمجھتا ہے نا کیا ریلیشن ہیں کیا نہیں!''

''چلو تم لوگوں نے اسے مان لیا...... ٹینشن ختم......'' پروفیسر ساہنی نے گہری سانس لی۔

''پاپا کو اب ٹینشن بہت ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''وہ فون کر کے بتاتی ہیں ان دونوں کا پانچ پانچ منٹ پر جھگڑا ہوتا ہے اور پاپا اسے مارتے پیٹتے ہیں...... ہماری ممی کو کبھی نہیں مارتے تھے نا! ممی ہر بات ان کے من کی جو کرتی تھیں۔ اب پچھتاتے ہیں۔''

''تم نے کہا تھا اس نے اپنی شرابی پتی کو مار دیا تھا؟''

''کرجت سے پہلے بھوئر واڑی آتا ہے نا! وہیں اس کی پہلی سسرال والے رہتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اس کی پہلی شادی کو دو سال ہوئے تھے۔ وہ اپنے پہلے پتی کے ساتھ

نیرل میں رہتی تھی۔ وہ روز پی کر آتا تھا۔ ایک دن جھگڑے میں اس نے ڈھکیل دیا اور وہ گٹر میں گر گیا۔ اس دن بارش بہت ہو رہی تھی۔''

''وہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے اسے منہ دبا کر مار دیا......''

''اچھا؟؟''

''لیکن اب وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ ہم سب کے ساتھ بہت اچھی طرح رہتی ہے۔ اس کے گھر جاتی ہوں تو میں اس کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتی۔ خود بناتی ہوں۔ اسے اچھا کھانا بنانا نہیں آتا۔ مگر میں نے اپنی ماں سے سیکھا ہے کھیر، لڈو، تہوار کا سب بھوجن بنا لیتی ہوں۔''

''چلو اب سب ٹھیک ہے نا؟'' پروفیسر ساہنی کی بات سنے بغیر ہی وہ اپنی دھن میں کہتی گئی، ''کبھی کبھی غلطیاں معاف نہیں ہوتی ہیں... مگر ہم نے پاپا کو معاف کر دیا۔ ممی بھی ایک بار لڑیں پھر چپ ہو گئیں۔ وہ ٹینشن سے بیمار بھی رہتی تھیں یہ شادی پاپا نے تب کی تھی جب میری دونوں بہنوں کے ایک ایک بچہ بھی تھا۔ بلکہ دونوں کی شادی بھی جلدی جلدی اِسی لئے کر دی تھی اور میری بھی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا نا آپ سے؟ ہمارا دو بیڈ روم ہال کچن کا گھر ہے دادی ایک کمرے میں سوتی ہیں۔ ممی ہمارے ساتھ ہال میں سوتی ہیں۔ انہیں اکیلے ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی دونوں بھائی اندر ممی کے بیڈ روم میں سو جاتے ہیں۔ میری چھوٹی بہن رنگولی بنانے میں بولنے میں، لکھنے میں بڑی تیز ہے۔ وہ ساتویں کلاس میں پہلے نمبر سے پاس ہوئی تھی۔ اور بھائیوں سے بیڈ روم کے لیے لڑتی رہتی ہے۔ اب میں آدرش اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ کشیلے شکشن سنستھا کے چیرمین نے کہا ہے کہ اسکول گورنمنٹ کا ہو جائے گا تو پے بڑھے گی۔ ابھی سولہ کو ایک مہینہ ہوا۔ اسی لئے کالج صرف سنیچر کے دن آسکتی ہوں۔ اب مجھے نوٹس کی ضرورت تو پڑے گی ہی نا! میڈم جی! آپ مجھے آج ہی نوٹس دے رہی ہیں نا۔!!''

☆☆

چاہے ان چاہے

اُنہیں دنوں میری رامیشور راؤ سے دوستی ہوگئی۔

رامیشور راؤ کمپنی میں سول کانٹریکٹر کے ساتھ سینٹرنگ کا کام کرتا تھا۔ کچھ پڑھا لکھا تھا۔ مجھے اُس کا سُبھاؤ بے حد پسند تھا۔ لنچ ٹائم میں اور ڈیوٹی ٹائم کے بعد وہ کچھ وقت میرے ساتھ گزارنا پسند کرتا تھا۔ مجھے گرو مانتا۔ اکثر شام کی چائے کے پیسے وہی ادا کرتا۔

''ارے یار! اب تُو اپنا کام اچھی طرح سیکھ گیا ہے۔ اپنے طور پر خود کوئی کام ڈھونڈھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا!''، ایک دن میں نے اُس سے کہہ دیا۔

''چھوٹا سا ایک کام ملا تو ہے۔''، اس نے نرمی سے کہا۔

''تو کیوں نہیں کرتا؟''میں خوشی سے بولا

''پیسہ نہیں ہے۔''، وہ سر جھکا کر ہنسا۔

''کتنے کی ضرورت ہے؟''

''ایک لاکھ تو لگے گا ہی۔''، میری بات سن کر وہ ذرا سا چونکا تھا۔

'چٹ فنڈ سے بات کرلو۔''، میں نے رائے دی۔

''شیوریٹی مانگتے ہیں۔''، اس نے مجبوری ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے نا!''، میں نے اُسے دلاسا دیا۔

تین لوگوں کی شیوریٹی لگتی تھی۔ میں نے اپنے دو دوستوں سے فارم پر سائن کروا کر اُسے دے دیا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس نے چٹ فنڈ کے پیسے لوٹا دیے۔ وہ دوستوں کے

سامنے میرے چرن چھونے لگا۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔

''اچھی ترقی کیا باوا تو!''، اُسے ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر میرے ساتھی اُسے شاباشی دیتے۔

رامیشور کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے کامپلیکس لے کر کام کرتا۔ اس کے لئے جب کبھی پیسوں کی ضرورت ہوتی، وہ پیپر لے کر میرے پاس آجاتا تھا۔ اپنی اور اپنے دوستوں سے سائن کروا کر میں اس کی ترقی کا شریک بنتا۔

''آپ ہی میرے گرو ہیں۔ ورنہ میں اناتھ مزدور......!'' میں اُس کی اس طرح کی بات کو ہمیشہ یہ کہہ کر کاٹ دیا کرتا۔

''تجھے بڑھتے دیکھ کر مجھے لگتا ہے، جیسے اپنے بچے کو رینگنے سے لیکر دوڑتے ہوئے دیکھنے کی خوشی پا رہا ہوں۔''

لتیکا نے بھی اُس کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی پسند کی بہو نیلور سے لے آئی......اس کے اپنے بھائی کی بیٹی۔

اُس دن میں سٹور روم میں بیٹھا چائے کے وقفے میں چائے پی رہا تھا کہ کورٹ کا نوٹس لئے ہوئے میرے دونوں ساتھی میرے پاس آئے۔

''یار ریڈی رامیشور نے کئی مہینوں سے چٹ فنڈ کی قسطیں نہیں بھری ہیں......اور ضامن کی حیثیت سے اب اسے ہمیں چکانا ہے۔

''پوچھ کر بتاتا ہوں۔'' میں نے دوستوں کو تسلی دی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ اپنی ڈیوٹی کرتے تھے۔ کبھی کبھار اتفاق سے مل جاتے تھے۔ اب کئی دنوں سے ہم دوستوں کا ملنا نہیں ہوا تھا۔ میں رامیشور کے گھر گیا۔ اُس کی بیوی پریشانی سے بولی،

''وہ ہفتہ دس دن میں گھر آتے تھے۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تو رات ایک بجے تک ان کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اب بیس دن ہوئے، رامیشور کی کوئی خبر نہیں۔ گھر میں دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں کس سے مانگنے جاؤں؟''

میں نے دو سو روپئے اسکے بچے کے ہاتھ میں رکھ دئے اور چلا آیا۔ مہینے بھر بعد

رامیشور کی بیوی ہمارے گھر آئی، بولی

''ان کے آنے کا بھروسہ نہیں۔''

''یہ سفر خرچ کے لئے ہیں...... اپنی ماں کے پاس جا کر رہ۔ وہاں تو آ سکتا ہے رامیشور، یہاں کا سچ مچ بھروسہ نہیں۔'' بیوی سے اسے پانچ سو روپے دلوا کر میں کم سے کم اس سے مکت ہو سکا تھا۔

اس واقعہ کے بعد پتہ چلا کہ رامیشور راؤ کی اچانک ترقی سے دوسرے کانٹریکٹروں نے مارے جلن کے گروپ بنا کر اس کو شراب پینے اور جوا کھیلنے کی لت لگا دی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم منافع رکھ کر کوٹ کرتا، جس سے اسی کو آرڈر ملتے۔ اس کے بعد کئی بار رامیشور چٹ فنڈ سے قرض لینے کے لئے میرے پاس آتا رہا تھا۔ اور میرے دوستوں نے میرے بھروسے پر ہر بار شیوریٹی دی تھی۔ پتہ نہیں چلا کہ پچھلے ڈیڑھ سالوں سے وہ مال ڈال کر بیس پچیس ہزار اُٹھا لیتا اور اپنے شوق میں لگا دیتا۔ شاید تبھی سے وہ چٹ فنڈ کی قرض کی قسطیں بھی نہیں بھر رہا تھا۔ آخر کورٹ سے نوٹس آیا تب پتہ چلا۔

''تمہارے کہنے پر ہم سائن کرتے رہے...... اور......'' دوستوں نے دبے لفظوں میں شکایت کی، ''اور...... اب یہ نوبت آئی ہے۔''

''فکر مت کرو۔ تم کو تکلیف ہونے نہیں دوں گا۔'' میں نے اپنے ساتھیوں کو تسلی دی۔

راؤ سے قربت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بھائی بہنوں سے بڑی دوری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ مرغی مر جائے تو جس طرح اس کے چوزے بچھڑ جاتے ہیں، اسی طرح ہم سب بچھڑ گئے! کیسا بھرا پُرا خاندان تھا ہمارا! اب کوئی کسی کا نہیں رہا۔ سب اپنے بال بچوں کے ہو گئے۔

''نیلو رمیں، تیری نانی کے گھر تجھے بہت پیار، مان ملا تھا۔ گھر میں پہلے نواسے کے جنم پر نانا نانی تجھ پر فدا تھے۔'' ماں کی آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے۔

ڈیڈی بھارت ہیوی الیکٹریسٹی میں جنرل مینیجر تھے۔ وہیں یعنی بی ایچ ای ایل

کالونی میں ممی ہائر سیکینڈری سکول میں ٹیچر تھیں۔ ہم سب بچے اسی سکول سے پڑھے۔ نام پلی کے 'گورنمنٹ جونیئر کالج' میں فائنل ائیر میں تھا کہ ایک دن ممی کی جان ذیابیطس نے لے لی۔ اور ہم سب مرغی کے چوزوں کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ میرے پیچھے کی تینوں بہنوں کی شادی جلدی جلدی کر دی گئی اور ان کے پیچھے کے تینوں بھائی آئی ٹی آئی کا کورس کر کے نوکریوں پر نکل گئے۔

''بچوں کو گریجویٹ بنانے کی میری خواہش کو ایک تو ہی پورا کر سکتا ہے، شاید!'' ڈیڈی میری پڑھائی خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''لیکن میں کام کرتے ہوئے ہی پڑھوں گا، ورنہ نہیں۔ میں آپ کو اکیلے نہیں ہونے دوں گا، ڈیڈی''۔

ڈیڈی نے میرا ہاتھ بڑے زور سے دبایا تھا۔

''کام کا پریشر زیادہ ہے۔ چار پانچ لوگوں کی ضرورت ہوگی۔'' کہہ کر ڈیڈی نے مجھے بھی اپنی کمپنی میں کام پر لگا لیا۔

میں سٹور کیپر کی ٹریننگ لینے لگا۔ دو سال بعد میں سٹور سپر وائزر ہو گیا۔ ۱۹۸۶ میں میری شادی لتیکا سے ہوئی۔ اور میں ڈیڈی کے پیار کا پوری طرح قائل ہو گیا۔ لتیکا کمان جیسی بھوؤں کے بیچ بڑا سا سیندور کا لال ٹیکا لگاتی۔ سب کہتے وہ مجھے بہت سُہاتی ہے۔ وہ معقول قد کاٹھی کی راجکماریوں جیسی باوقار عورت ہے۔ ناک میں بڑا سا نازک ہیرے جڑا پھول، کانوں میں چمکتے ہوئے ہیرے کے بڑے بڑے بُندے اور اُس کی بالوں میں غائب ہوتی سونے کی زنجیر، اُس کے چہرے کو پُر نور بناتی ہے۔ پہلے اپنے پتا کے گھر سے لائے ہوئے ہیرے کے اصلی گہنوں سے سجی رہتی تھی، اب ایک گرام سونے سے بنے گہنوں میں جھجھماتی ہے۔

بس اُنہیں دنوں رامیشور راؤ سے میری دوستی ہو گئی۔

دونوں دوست کورٹ کا نوٹس پکڑے ہوئے آئے تو میں نے اُن سے کہا،

''کورٹ سے پیمینٹ روک دیا گیا ہے۔ انشیورنس کو چھوڑ کر تنخواہ میں سے کچھ

نہیں نکلتا۔ پرسنل ڈپارٹمینٹ میں نوٹس جانے کی وجہ سے تنخواہ سیدھے چٹ فنڈ میں چلی جاتی ہے۔ کمپیوٹر میں سیلری کی جگہ سٹارس آتے ہیں۔''

''کیا کریں''؟

میں نے اچھے دنوں میں ایک اور مکان بنالیا تھا۔ جس کے کرائے سے میں اپنا گزارا کرسکتا تھا۔ مگر دونوں میرے سامنے پریشان کھڑے رہتے۔ انہیں دنوں کمپنی کی وی آر ایس سکیم نکلی۔ میں نے عرضی دی۔ سینئر مینیجر نے مجھے بلایا اور میرے سامنے عرضی پھاڑ دی۔

''مانتا ہوں سر آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ لیکن میری یہ حالت......!''

''پاگل ہوگئے ہو کیا؟'' میری بات سُن کر باس نے کہا۔

''ابھی کافی سروس باقی ہے تمہاری!'' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے،'' چار لاکھ کا تم بندوبست کرو۔ باقی میں کچھ سمجھاتا ہوں۔''

''باقی ......یعنی ساڑھے چار لاکھ......!!'' پھر میں سنبھل کر بولا،'' صاحب میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں......لیکن چار لاکھ......! نہیں نہیں......اتنے پیسے جمع کرنا میرے بس کا نہیں!'' میں نے والینٹری ریٹائرمنٹ کا دوسرا فارم مانگ کر اُس پر سائن کروالیا۔ چٹ فنڈ کے پیسے جمع کروادئے۔ ساڑھے پانچ لاکھ تھے۔ باقی رقم اپنی سیونگ سے نکال کر بھر دئے۔ اور یہ باب بند ہوگیا۔

میری زندگی کا صفحہ اچانک پلٹ گیا تھا۔

''تمہاری کورٹ میں پہچان ہے۔ ذرا ساتھ چلو۔''

''اسپتال کے ڈین سے کہہ کر علاج کا خرچ کچھ کم کروادو۔''

''بچے کے داخلے کے لئے جانا ہے۔ مجھے تو بولنا نہیں آتا۔ آپ بڑے اثر دار ڈھنگ سے بولتے ہیں۔ ذرا ساتھ چلیں تو مہربانی ہوگی۔''، سماج سیوا تو میں پہلے سے کرتا آرہا تھا۔ جان پہچان والے کسی نہ کسی کام کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ صبح کا گیا، پتہ نہیں میں کب لوٹتا! کھانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ بہت بار گھر والوں کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

'معذور ہوا ہوتا تو الگ بات تھی۔ کام کر سکتا ہوں مگر نہیں کر سکتا'، بس یہی خیال ذہن میں گھومتا رہتا۔ ذیابیطس نے زور پکڑا۔ صحت خراب ہوئی۔ چکر آنا اور گرنا میرے لئے معمولی بات تھی۔ اور سب کی وجہ تھی ٹینشن۔ ایڈمٹ کیا جاتا، انسولن کے ڈوز دیئے جاتے۔

اس دن میں حسین ساگر کے پُل پر کھڑا زندگی سے بھرپور اُس ماحول کا نظارہ کر رہا تھا، جس میں میں شامل نہیں تھا۔ گوتم بدھ کی شاندار مورتی میرے دل کو سکون بخش لگ رہی تھی۔ کسی دوست کو اِس طرف آنا تھا، اُسی کے ساتھ چلا آیا تھا۔ واپسی میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔ ساگر کے پانی میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ میں ساگر کی گہرائی میں جھانکنے لگا، جیسے اپنے ہی دل کی گہرائی کے آر پار جھانک رہا تھا، 'آہ! کیا حال کر لیا ہے میں نے اپنا! اب کون کسی کی مدد کرے اور کیوں!'، میں خود سے باتیں کر رہا تھا اور اپنی ہی آواز سن رہا تھا۔ آس پاس کی ساری آوازیں اس آواز میں گم تھیں۔ مجھے جیسے ہوش ہی نہ تھا کہ ایک ذرا مانوس سی آواز نے میری محویت کو توڑا، ''انکل ہم رائیگڑھ، مہاراشٹر کے کھپولی علاقے میں اُتم سٹیل کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ وہاں ہم لوگوں کو کھانے کی بڑی پرابلم ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ہم روٹی کھا کھا کر بور ہو گئے ہیں۔ آپ وہاں ہوٹل کیوں نہیں کھول لیتے!''

''تم کو کوئی اور نہیں ملا کیا؟ اپنے باپ دادا نے بھی کبھی یہ کام نہیں کیا! اپنے کو تو چائے بنانا بھی نہیں آتا...... ہاں میرا ایک پہچان والا ہے۔ وہ ایسا ہی کچھ کرنے کا سوچ رہا ہے۔''

''اِنہیں اُنہیں چھوڑیئے انکل! آپ ہی کیجیے۔ ہم آپ کو کاریگر دلاتے ہیں۔'' یہ دونوں میرے ایک پرانے دوست کے بیٹے تھے۔ اور جنوبی ہندوستان کے کھانوں کو ترس رہے تھے۔

انہیں کی مدد سے کھپولی میں میں نے ایک جگہ کرائے پر لے کر، دم کی بریانی، پٹّی سموسہ، کوفتہ، پایا، تندوری روٹی، اڈلی دوسا، میدو وڑا، پیسرٹ، منپٹ اور اُپما، اپم کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہوٹل شروع کیا۔

کھپولی کا لکشمی نگر کہلانے والا یہ علاقہ 'گگن گری مہاراج'، کے مشہور مٹھ کے بہت

قریب واقع ہے۔ پاس ہی ٹاٹا کمپنی کی کالونی ہے۔ آس پاس کافی مارواڑیوں کی رہائش ہے۔

''سیٹھ ایسے کام نئیں چلتا۔ کچھ شرابی یہاں آتے اور دادا گیری کرتے۔''، ایک دن میرے کام کے ساتھی نے مجھ سے شکایت کر ہی دی۔

''کوئی خود کو سیٹھ کہنے والا بدمعاش ہمارے کاریگر آدمی کو پارٹی کے لئے کھانا بنانے کے لئے لے گیا تھا۔''

''کب؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''پرسوں کی اِچ بات جی! بھول گئے کیا؟'' وہ بولا۔

''ہو، یاد آیا۔ پھر......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''کل آ کو پیسے لے کر جانا بول کو، کھانا کھلا کو بھیج دیا۔'' میرا دوسرا ساتھی بولا، ''کون سا کل وہ! کسی نے دیکھا ہے کل کو صاحب؟ انتظار کر لے کو بیٹھنا سو؟''

''صحیح بولے تُم ۔ یہ تو غلط بات ہے۔'' میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

''صحیح نا!......اب کوئی دوسری اچھی سی جگہ دیکھ کر بلاؤ ہم کو ساب! یاں ہم کام نئیں کر سکتے۔'' کہہ کر کاریگر اپنے ساتھیوں کو لے کر نکل گیا۔ رہ گئے صرف بیس پچیس رائس پلیٹ، اڈلی کھانے والے گاہک اور میرے ساتھ کام کرنے والے دو لڑکے، جنہیں میں اپنے خرچ پر حیدر آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

ہمارے پڑوس کا ایک اور ہوٹل والا اسی وجہ سے دوکان بند کر کے آندھرا چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ مجھے اڈلی دوسے کے آٹے کی بڑی مشین ٹکٹ کے عوض دے گیا۔ پاروتی کا کام اب کچھ ہلکا ہلو گیا ہے۔

''کھانا بنانا جانتی ہے۔'' پچھلی بار جب حیدر آباد گیا تھا۔ لتیکا نے اپنی کسی سہیلی کی پہچان کی ایک غریب عورت سے مجھے ملایا تھا۔ ''مگر تیلگو کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتی۔ لتیکا کی سفارش پر میں نے پاروتی کو کھچولی بلایا تھا۔

اُنہیں دنوں جس کی دوکان میں ہم نے ہوٹل کھولا تھا، اُس سیٹھ کا بیٹا گزر گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ میرے پاس آیا۔ بولا، ''ہم سب کچھ بیچ باچ کر، یہ جگہ چھوڑ کر جانا چاہتے

ہیں۔ ہمیں راس نہیں آیا یہ شہر!''

''ٹھیک ہے صاحب! ہم جاتے ہیں۔ ہم چار دنوں میں آپ کی یہ دوکان خالی کر دیں گے۔ ٹھیک صاحب؟'' میں نے اس کی مجبوری سمجھ کر قبول کر لی اور اتنی جلدی میں دوکان چھوڑنے کی پریشانیوں کو سوچے بغیر ہی فوراً جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اگلے دن ہی دوکان مالک کی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ اڈلی کا پارسل لینے آئی۔ میں نے اپنی تیاری کی بات کی تو بولی،

''آپ کیوں جاتے ہیں؟ ہم تو کہیں نہیں جانے والے! بھاڑا زیادہ دینے والا مل گیا ہوگا۔ ضرور اسی لئے میرے آدمی نے ایسے کہا ہوگا! ہمیں تو آپ کے ہوٹل کے ناشتے کے بغیر نہیں چلتا!''

''میں تو آپ کو کرایہ بھی دیتا ہوں اور لائٹ بل بھی!! کہئے تو بھاڑا بڑھا دیتا ہوں!'' میں نے کہا۔

''پاپا نہیں مان رہے انکل! مگر آپ رہ جایئے۔ ہم دیکھتے ہیں۔'' اس کی بیٹی ضد سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

بڑی عجیب بات لگی۔

''زیادہ ملتا تھا! بولنا تھا نا! بتایا ہوتا تو میں ہی دیتا نا! اب میں یہاں نہیں رہوں گا...... حیدرآباد کے لئے جلد از جلد نکل جاؤں گا۔'' مجھے بے حد بُرا لگا تھا۔

''عادت ڈال کر جانا اچھا ہے کیا؟'' دونوں نے کہا۔ گاہکوں نے بھی اصرار کیا۔

'پھر تو کچھ دیکھنا ہوگا'، میں کچھ سوچنے لگا۔

ایک کاروباری مجھ سے بات کر کے دوکان کا ایک گالا خرید رہا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے 'چامنڈا جویلرس' والے ایک سنار کا بیٹا مجھ سے بار بار پارٹنرشپ کی بات کرتا تھا۔ بلکہ اِس کے لئے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

''یہ نہیں ہوگا۔ نقصان ہوگا، کون اُٹھائے گا؟ جتنا مانگنا ہے، مانگ لو۔ آخری بار بتاتا ہوں، دنیا ایسی ہی ہے۔ نقصان بتایا تو تمہارے دل میں آئے گا کہ میں نے تمہارا

بھروسہ توڑ دیا...... تمہارا دل ٹوٹے گا، ناطہ ٹوٹے گا۔''

بس میرے صاف صاف اتنا کہہ دینے پر اس نے ایک اسکول کے سامنے والی اپنی دوکان مجھے کرائے پر دے دی۔ میں نے دوکان کے ایک حصے میں کچن اور دوسرے میں پرانی میزیں لگا دیں۔ وہی پرانا گگن گری نگر والا سامان شفٹ کیا۔ سنار کے بیٹے نے کالے گرانائٹ سے کچن ترتیب دیا۔ وہی پرانا بڑا فرج بھی ہے، جس میں منرل واٹر، پیپسی اور مینگولا کی بوتلیں رکھتا ہوں۔

لتیکا کے بھانجے کو میں نے بھوشن کمپنی میں اپنے ایک مینیجر گاہک سے کہہ کر نوکری پر لگایا تھا۔ یہ کمپنی میرے ہوٹل سے پانچ سات کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ میرا ہوٹل بور گھاٹ، کھنڈالا کے شروعاتی حصے میں ہے۔ شروع شروع میں ایک بار میں نے اُسے تین چار دن اپنی دوکان میں سلایا۔ پھر اُسے کمرہ الاٹ ہو گیا۔ اب وہ یہاں نہیں آتا، لیکن لتیکا کی اس کے آنے سے تسلی ہو گئی۔

یہ عورت یعنی پاروتی، تیرہ برس کی عمر میں اپنے ماما سے بیاہ دی گئی تھی۔ اُن کے کُل میں شادی کے لئے ماموں کا بھانجی پر سب سے پہلا حق ہوتا ہے۔ پاروتی کا ماما اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ ماما نے اپنی پہلی بیوی کو بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے میکے میں چھوڑ دیا تھا۔ مغربی گوداوری کے ضلعے میں املا پورم کھیڑے میں، چودہ برس کی عمر میں پاروتی ماں بن گئی تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ شوہر پی پی مر گیا۔ پاروتی میکے چلی آئی۔ بڑے ہو کر بیٹے نے باپ کا راستہ پکڑا۔

''شادی کر دو۔'' لوگوں نے کہا۔

'سدھرے گا، شادی کروا دو۔''، رشتہ داروں نے بھی ضد پکڑی۔ بلکہ کسی نے رشتہ بھی بجھا دیا،'' بے ماں باپ کی ایک لڑکی ہے۔ لڑکی کی نانی اُس کی شادی جلدی کروانا چاہتی ہیں۔''

یہی احساس پاروتی کو سب سے زیادہ ہے۔

'پاپ باندھ لیا میں نے!' کبھی کبھی وہ دکھی ہو کر بڑبڑاتی ہے۔

آج پاروتی کی بہو ایک پرائیویٹ اسکول میں صفائی کرمچاری کا کام کرتی ہے۔ پتی آوارہ گردی کرتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں بھٹکتا رہتا ہے! تین چار مہینوں میں وہ دس بارہ دنوں کے لئے گھر آ کر رہتا ہے۔ پیسہ کھینچ کر لے جاتا ہے۔

پرسوں پاروتی کی بہو کا خط آیا۔ میں نے اُسے پڑھ کر سنایا۔

''اسکول کا کام چھوٹ گیا ہے۔ گھروں میں کام کرتی ہوں۔ بڑا ادھر اُدھر بھٹکتا ہے۔ باپ جیسا نہ ہو جائے۔! ریڈی صاحب سے بات کر کے دیکھو۔ وہاں، اپنے یہاں، وہ اُسے اسکول میں ڈال سکیں گے کیا؟ چھوٹے کو اپنے ساتھ رکھوں گی۔''

خط سُن کر پاروتی تڑپ کر پوچھتی ہے، ''میری سیلیری سے کٹ کرو!''

پاروتی گہرے سانولے رنگ کی معمولی عورت ہے۔ اس کی آنکھوں کی پُتلی کے اِرد گرد بھورے رنگ کا گھیرا ہے، جو اُس کے گول چہرے کو پُرکشش بناتا ہے۔ گھنی پلکوں تلے اُس کی آنکھیں مجھے، اُس کے میرے ساتھ محفوظ ہونے کا احساس کراتی ہیں۔ سستی سوتی ساڑی کا پلّو اُس کے سینے پر پھیلا رہتا ہے مگر کمر میں ریڑھ کی ہڈی کی درمیانی گہرائی کھلی رہتی ہے۔ وہ اکیلی ہی کچن کے سارے کام کرتی ہے۔ کالے بالوں کا بے ترتیب جوڑا باندھتی ہے۔ گاہک کی باتوں سے کچھ کام کے لفظ سمجھ لیتی ہے۔ اور ٹیبلوں پر سامبر، چٹنی یا پانی پہنچا دیتی ہے۔ بات سمجھ میں نہ آئے تو مسکرا دیتی ہے۔ مسکراتے ہوئے وہ بھلی لگتی ہے۔ اُس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ بھیڑ کے وقت ٹیبل پر پلیٹ میں رکھتا ہوں۔ جب میں حیدرآباد ہوتا ہوں، وہی غلّہ سنبھالتی ہے۔ کبھی کبھی اُس کا پوتا بھی اُس کی بھاشا کا مسئلہ حل کرتا ہے۔ اب وہ پاس ہو گیا تو چھٹی کے بعد، تیسری میں جائیگا۔ یہاں تیلگو ذریعۂ تعلیم کے اسکول نہیں ہیں۔ انگریزی اسکول والے، داخلے کے لئے دس ہزار روپئے ڈونیشن لیتے ہیں۔ اندازہ بھی تو نہیں تھا کہ یہاں رہے گا بھی کہ نہیں! ہم تینوں، ہوٹل کے پیچھے بنی ایک کھولی میں رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں سارا کام اب میں اور پاروتی ہی کرتے ہیں۔ دوکان بدلتے وقت دونوں لڑکوں کو کسی نے دوسرے کاموں پر کھینچ لیا۔ ویسے بھی وہ ناامید ہو چکے تھے۔

پاروتی کو میں نوکر نہیں سمجھتا، لیکن لوگ اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ زیادہ کام کی وجہ سے اس کی کمر میں درد رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے کوئی مقرّرہ چھٹی نہیں رکھی۔ جب کوئی بڑا آرڈر آجاتا ہے تو، اگلے دن اس کی تھکن کو محسوس کرتے ہوئے دوکان بند رکھتا ہوں۔ چھٹی کے دن فرج میں رکھی ہوئی چیزیں بچ جاتی ہیں۔

ہمارا ساؤتھ انڈین ناشتہ دور تک مشہور ہے۔ لوگ فون پر آرڈر دیتے ہیں۔ اور ٹفن لے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کے گاہک اِڈلی کے ساتھ گن پاؤڈر کی بھی مانگ کرتے ہیں۔ دھنیا، زیرا اور غیرہ سوکھے بھونے ہوئے مسالوں کو پیس کر گن پاؤڈر بنایا جاتا ہے۔ مہاراشٹر میں وڑا پاؤ کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اس لئے کاؤنٹر پر وہ بھی مہیا کرانا ہوتا ہے۔

پاروتی کے تیلگو کے علاوہ دوسری زبان نہ جاننے کا مجھے افسوس نہیں۔ شاید اسے بھی بہکا کر لے گئے ہوتے! پھر مجھ سے یہ ہوٹل کیسے چلتا! اُسی کے دم سے تو یہ ہوٹل ہے۔

روز کی طرح ہم صبح پانچ بجے اُٹھ کر روزانہ کے کاموں سے فارغ ہو کر ہوٹل کے کام پر لگ گئے تھے۔ میں کاؤنٹر پر غلّہ چیک کر رہا تھا۔ کل حساب میں کچھ گڑ بڑ سی لگی تھی۔ پورے پانچ سو کا گھاٹا دکھائی دیا تھا۔ پاروتی نے چکّی کی مشین میں اُڑد کی دال ڈال کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ تبھی میری نظر ہوٹل کے برآمدے میں پڑے ایک ٹیبل پر پڑی۔ ایک شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی پلکوں کی چھاؤں اس کے گالوں پر پڑ رہی تھی۔ دو پٹی چپل، دھاری دار ہلکا گلابی شرٹ اور کالی پتلون میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ کر کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگا تھا کہ یہ رامیشور ہے۔ میں نے پاروتی کو اشارہ کیا۔ گاہک کو بیٹھا دیکھ کر وہ تیلگو میں بولی،

''ناشتہ سات بجے سے ملے گا، بول دو، 'ایک گھنٹے بعد آؤ' ...''

میں نے پاروتی کو بیکار ہی اشارہ کیا تھا۔ وہ رامیشور کو کہاں جانتی تھی!

رامیشور جیسے دکھائی دینے والے اس شخص کو میں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ پاس گیا تو اُس نے نظر اُٹھائے بغیر جھک کر میرے پیر پکڑ لئے۔ ہاں وہ رامیشور ہی تھا۔

میں چپ چاپ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''رامیشور!'' میں نے حیرانی سے اُسے آواز دی۔

''سر...... سر...... معاف کر دیجئے!''

''کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ میرے سامنے تھا۔ اب تک اُس نے آنکھ نہیں اُٹھائی تھی۔

''بچے کچھ پیسے لے کر سعودی عرب بھاگ گیا تھا۔ اب سُدھر گیا ہوں...... آپ کا قرض لوٹانے آیا ہوں۔''، اُس نے ٹیبل پر پیسے رکھے۔

''تُو قرض لوٹائیگا رے؟ میری تو زندگی ہی قرض بنا دی تو نے!''

''ساری سر!''

''اور یہ چار بنڈل؟؟''

''سود سمیت لوٹا رہا ہوں سر۔''

''سود سمیت؟'' میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اچانک سامنے آ کر پاروتی تیز نظروں سے مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور تیلگو میں بولی، ''ناشتہ جلدی دونگی''۔ اس نے ہمیں تیلگو میں بات کرتے ز ہوئے سن لیا تھا۔

مہینے میں ایک بار اپنے گھر حیدر آباد جاتا ہوں، مہمان کی طرح!

''آپ کے لئے کوئی آیا ہے۔' لتیکا مجھے بتاتی ہے۔

''بلڈ ٹیسٹ کرالیا کیا؟'' لتیکا کا دن کے اخیر میں پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔

''رپورٹ آ گئی کیا؟'' میرے ہاتھ میں رپورٹ دیکھ کر یہ سوال اُس کی زبان پر آ جاتا ہے۔

''چلو کھانا لگا دیا ہے۔''...... بس یہی بات چیت ہوتی ہے، ہم دونوں میاں بیوی کے بیچ! تبھی دوست یا کوئی اڑوسی پڑوسی بلا کر لے جاتا ہے۔

''پانچ منٹ میں آتا ہوں۔'' کہہ کر اُن کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ شام کو ہی لوٹتا ہوں۔ پھر کوئی نا کوئی آ جاتا ہے۔ رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہی لتیکا سے بات ہوتی ہے۔

''رپورٹ تو ٹھیک ہے۔'' وہ رپورٹ ہاتھ میں پکڑے کہتی ہے۔ ''انو کا ایرونا ٹکل انجینئرنگ کا فائنل ائیر ہے نا!'' وہ رپورٹ پرے رکھتے ہوئے مسکرا کر کہتی

ہے۔''امتحان ہوتے ہی شادی کی تاریخ پکی کرنی ہے۔ یاد ہے نا!...... انو نے اپنا ایک کلاس میٹ پسند کرلیا ہے...... کہ بھول گئے؟؟''

میں گردن ہلا کر''ہوں'' کرتا ہوں۔لتیکا بھی تو بس بیوی کے فرض ہی نبھاتی سی لگتی ہے۔لتیکا کو دھوکا دے رہا ہوں!

ہاں !لتیکا کو دھوکا دے رہا ہوں...... احساس ہے۔

کیا لتیکا سمجھتی ہے؟

کیوں نہیں سمجھے گی!

وہ تو ایسی تھی کہ کسی عورت کا میرے لئے فون بھی برداشت نہیں کرپاتی تھی۔

''باس کی وائف کا فون آیا ہے۔'' وہ مجھے فون پکڑا تو دیتی مگر بات کرنے تک وہیں کھڑی رہتی تھی۔فون رکھتے ہی تنک کر کہتی تھی،''یہ آدمی...... آپکا باس...... خود فون کیوں نہیں کرسکتا؟''لتیکا وہی عورت تو تھی!

پھر وہ چپ کیوں ہے؟ اُس نے میرا وہ زمانہ دیکھا ہے، جب میرے ماتحت تیس چالیس لوگ کام کرتے تھے...... یقیناً اسی لئے چپ رہتی ہے۔پاروتی کو لتیکا نے ہی تو کام پر رکھوایا تھا۔حیدرآباد سے چار پانچ سو کلومیٹر کی دوری کے چھوٹے سے گاؤں سے بلوایا اور کاریگر کے ساتھ خود بھیجا تھا۔

لتیکا خوش ہے، کہ میں زندہ ہوں...... اور بہتر صحت کے ساتھ۔میرا حال دیکھا تھا نا!

''لتیکا...... سنو! میں تو تمہیں خرچ تک نہیں دے پاتا۔ابھی پیسوں سے مضبوط کہاں ہوا ہوں! وہاں کا کمایا وہیں لگ جاتا ہے، تم جانتی ہو۔''

''انو کی چھٹیوں میں ہم ممبئی گھومنے جائیں گے۔'' وہ دھیرے سے بات بدلتے ہوئے کہتی ہے۔

''ہاں ڈیڈی! آپ کا شہر ممبئی اور پونا کے بیچ میں ہے۔آٹھ دنوں کی چھٹی ملنی ہے۔''،انو کو زیادہ پیار آجاتا ہے تو میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیتی ہے۔وہ بڑی سمارٹ اور بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔دیکھنے میں وہ مجھ پر ضرور گئی ہے مگر سبھاؤ ماں کا پایا ہے...... اُن دونوں

کو میں کیوں تکلیف دوں!! لتیکا مجھ سے کبھی پاروتی کے بارے میں نہیں پوچھتی۔

''ریڈی صاحب کہاں ہیں؟''، فون کبھی پاروتی اٹھالے تو اُسے پوچھ لیتی ہے، ''تم کیسی ہو پاروتی؟''

''ٹھیک۔ساب کسی کام سے باہر گئے ہیں۔'' پاروتی جلد سے جلد فون رکھ دیتی ہے۔

''کسٹمر آئے ہیں۔'' کبھی کبھی لتیکا کی صاحب کو فون دینے کی بات سن کر پتہ نہیں کیوں پاروتی اسے جھوٹ موٹ ٹال بھی دیتی ہے! ایسا کہتے ہوئے وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھتی بھی جاتی ہے۔ جانتی ہوگی، بیوی سے اس طریقے سے بات کرنے کا برا نہیں مانوں گا! اُس وقت مجھے پاروتی اپنی آنکھوں سے کچھ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

''بات کرنی ہے۔'' لتیکا بضد ہے، حق سے بولتی ہے۔ وہ سمجھتی ہوگی، کھپولی میں بھی میں نے نئے دوستوں کا دائرہ بنالیا ہوگا۔ وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے ہوں گے۔ کم سے کم ظاہر تو ایسا ہی کرتی ہے۔ وہ دھیرے سے پاروتی سے کہتی ہے۔'' صاحب سے کہنا، میڈم کا فون تھا۔فری ہوتے ہی فون کریں۔''

جس وقت لتیکا پاروتی سے ہلکے پھلکے لہجے میں بات کر رہی ہوتی ہے اور پاروتی کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی ہوتی ہے، میں چار خانے کی لنگی اور شرٹ میں انجان بنا سوچتا ہوں، 'شاید انجانے میں ہی ایسا ہو جاتا ہے!!......'

☆☆

ہزاروں خواہشیں ایسی...

''اٹھو شمع!''

''اوں!ں......ں......سونے دونا!'' وہ کسمسائی۔

''اٹھو شمع! جوان جہان لڑکیاں یوں صبح دیر تک سوتی رہیں تو گھر نحوست کی نذر ہو جاتا ہے۔ اٹھو نماز پڑھو۔ کنواری لڑکیوں کی دعائیں گھر کے لئے بہت اثر رکھتی ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ تمہارے ابو کو قرضوں سے نجات دلائے۔'' جی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھی، لوٹا لیا اور حمام میں گھس گئی۔ چھینکوں کے درمیان نماز ادا کی اور کمبل لپیٹ کر قرآن پڑھنے لگی۔ شمع کا پریوار ایک کمرے کی چال سسٹم والی شہنشاہ بلڈنگ میں رہتا تھا ہر کمرے میں جگہ کم اور آدمی زیادہ رہتے تھے۔ اسی لئے کئی گھروں میں پلنگ کے پایوں کے نیچے اینٹیں لگا کر اسے اونچا کر دیا گیا تھا۔ تاکہ بچے اس کے نیچے پڑھائی کر سکیں، سو سکیں۔ پورے محلے کا یہی حال تھا۔

''باجی بھوک لگی ہے۔'' پلنگ کے نیچے منی بلبلا رہی تھی۔

''جاؤ دونوں چولہوں پر رات کے سالن رکھ دو۔ میں ابھی آئی۔'' شمع بستر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''سالن تو ختم ہو گئے باجی! چائے گرم کر دوں؟''

''ہاں منی۔'' شمع بولی

''اٹھو نا باجی!'' تھوڑی دیر بعد منی چیختی چلاتی واپس آئی۔ ''کتنی دیر سے چیخ رہی ہوں، بھوک لگی ہے۔ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

''کون ناشتہ کرنے جارہا ہے، امی جان چلائیں۔

''منی کو زور سے بھوک لگی ہے۔''

''ابھی مرد اٹھنے نہیں ہیں اور عورتیں کھانے بیٹھ جائیں! منّی پہلے اٹھا کر رکھ دو سب۔''

''امی جان!'' شمع آہستہ سے بولی۔ ''منی نے چائے نکال دی ہے۔''

''رکھو پہلے اندر لے جا کر!'' وہ اس طرح دہاڑیں کہ شمع فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور تیار ہوکر بغیر ناشتہ کئے ہی کالج کے لئے نکل پڑی۔ نیچے اتر کر اس نے ایک نظر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ تینوں منزلوں کی سیڑھیاں ایک کے نیچے ایک جیسے قطار میں دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے لگا وہ سیڑھیاں اتر کر نہیں آئی ہے بلکہ سیدھی تیسرے منزلے سے نیچے پھینک دی گئی ہے۔ تین اور چار منزلوں کی چھوٹی چھوٹی عمارتوں کی درمیانی گٹر سے اٹھتی جانی پہچانی بدبو اسے گھیرے میں لینے لگی۔ شمع پلٹی۔ پتلی گلیوں کو دیکھتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔ چنا جور گرم کا خوانچہ لگایا ہوا ادھیڑ عمر کا آدمی اسے گھور رہا تھا۔ ابھی بسکٹ اور ابلے انڈوں کے خوانچے والوں اور پھلوں کے ٹھیلے والوں کو اس کے وہاں سے گزرنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

''نافرمان کہیں کی!'' امی نے سارا دن اس سے بات نہ کی۔

دوسرے دن دوپہر ڈھلے شمع پلنگ کے نیچے بستر پر لیٹی پالیٹکس کی کورس کی کتاب میں مگن تھی۔ حسن بیمار بھی تھا اور غمزدہ بھی۔ تبھی پڑوس کی ایک عورت آئی۔

''چاچی بڑا پتیلا چاہئے۔''

چھوٹے گھروں میں سامان رکھنے کی جگہ بھی کم ہوتی ہے۔ اسی لئے مہمان کے آنے پر گدّے،، بستر وغیرہ لئے دئے جاتے ہیں۔ کچھ میری ضرورت کچھ تمہاری ہوتی ہے، سب کی پوری ہو جاتی ہے۔ امی جان چٹائی پر لیٹی آرام کر رہی تھیں۔ سستی سے اٹھیں اور دیوار پر لگی ابرائی یعنی لکڑی کی پھلی سے بڑا پتیلا بیٹے سے کہہ کر اتروایا۔ اور پڑوسن کو دے دیا۔ اس وقت وہ موڈ میں نہیں تھیں، ورنہ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ضرور کرتیں۔ کم سے کم گھر میں بڑے پتیلے کی کیا ضرورت آپڑی ہے، یہی پوچھ لیتیں۔

یہ محلّہ ہمیشہ انسانوں سے بھرا رہتا تھا۔ اسی لئے آپسی میل جول زیادہ تھا۔ اور شاید اسی لئے گھروں میں یا محلے سے جھگڑوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھی۔ دکھ سکھ میں رشتہ داروں سے پہلے یہی لوگ دوڑے بھی تو آتے تھے۔

امی جان شمع کے پاس آکر لیٹ گئیں۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، بولیں،

''شمع بیٹے! وہ اپنے پڑوس میں حارث صاحب رہتے ہیں نا!''

''جی''۔

''انہوں نے اپنے بیٹے زید کے لئے تیرا رشتہ مانگا ہے۔''

''..........''شمع نے آنکھیں موندلیں۔

''کیا کہتی ہو؟''

''بہت بدصورت ہے امی۔''

''چپ بے شرم کہیں کی! کہیں اپنے ہونے والے دولہے کے بارے میں ایسا بھی کہتے ہیں! خوبصورتی کیا گھول کر پیئو گی؟ شریف لڑکا ہے۔ پھر دولت مند بھی ہے۔''

وہ چپ چاپ امی کا منہ تکنے لگی۔

''کیا کہتی ہو؟''

''میں کیا کہوں؟''

''کیا خاموشی کو میں رضامندی سمجھوں؟''

وہ پھر بھی چپ رہی۔

''میں نہ کہتی تھی، میری شمع پڑھی لکھی ہے تو کیا ہوا۔ گائے کی طرح ہے۔ خوش رہو''۔ امی نے شمع کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتی چلی گئیں۔

''بیٹے شمع! زید بڑا شوقین لڑکا ہے۔ کلبوں پارٹیوں میں جانے کا بھی شوق ہو تو عجب نہیں۔ آج کل دنیا ایسے ہی لوگوں کو ماڈرن کہتی ہے۔ شادی کے بعد اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنا۔ خدمت اور محبت سے ہی دل جیتا جاسکتا ہے۔ اس کے کپڑے ہمیشہ تیار

رہیں۔ چیزیں سلیقے سے اپنی جگہ پر رہیں۔ جوتے ہمیشہ ایک روز پہلے پالش کر کے رکھ دیا کرو۔" لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر شمع نے اپنے چہرہ کو اپنی بانہوں کی قید میں لے لیا۔

"اور ہاں شادی کے بعد شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی بات پر اپنا سب کچھ قربان کرنا۔ کوئی شکایت نہ سنوں۔ وہ جیسا کہے ویسا ہی کرنا۔ ناچنے کہے، ناچنا، گانے کہے، گانا۔"، وہ مسکرائیں تو ان کے چہرے کی مانس پیشیاں کچھ ڈھیلی ہوئیں۔

"مجھے اتنا بے عزت نہ کریں، امی جان!" شمع اٹھ بیٹھی۔

رات کے اندھیرے میں کھڑکی سے چھن کر آتی مدھم روشنی میں پاس لیٹی منّی نے شمع باجی کا درد ان کے چہرے پر غور سے دیکھا۔ شمع کی منہ زوری پر امی جان کو خوب غصہ آیا تھا۔ "اسی لئے میں تجھے پڑھانے کے حق میں نہ تھی۔ ہائی اسکول سے ہی ختم کروا دیتی۔ لیکن تیرے ابا کو بڑا شوق تھا نہ! بس یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ عورت اپنے کو مرد کے برابر سمجھنے لگے، تو ہو چکا...... ۔ اری حرامزادی!...... شوہر مجازی خدا ہوتا ہے، خدا میں کا آدھا خدا...... خدا کے بعد اگر کسی کا سجدہ جائز ہوتا، تو وہ شوہر کا ہی ہوتا...... ۔ اس برس سے منی کو گھر نہ بٹھالیا تو رحمت بی نام نہیں...... اللہ اللہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!!" امی جان کروٹ بدل کر سو گئیں اور ان کے خراٹے فضا کو بوجھل بنانے لگے۔

"اف اللہ!" شمع کے ہونٹوں سے سسکی نکلی، "یا تو مجھے سو سال بعد پیدا کرنا تھا، یا سو سال پہلے......!" وہ بدبدائی۔

"کیا کہتی ہو باجی؟"

"کچھ نہیں منی...... ابھی تو نہیں سمجھے گی......"

"باجی...... ٹھہرے ہوئے گہرے لہجے میں منی بولی۔ "میں سمجھتی ہوں، تم انسان بن کر رہنا چاہتی ہو۔"

"انسان نہیں ہوں؟" شمع نے ہنس کر بات ختم کرنی چاہی، مگر منی کی پیشانی پر ابھری لکیریں شانت نہیں ہوئیں۔ بولی

"سو سال پہلے پیدا ہونا چاہئے تھا نہ تمہیں؟"

''ارے! کیا میں پرانا ماڈل لگتی ہوں؟'' شمع کو ہنسی آگئی، بن کر بولی۔ ''یا میرے خیالات تمہیں فرسودہ سے لگتے ہیں منی!''

''......سو سال پہلے پیدا ہوئی ہوتیں، تو تمہارے ذہن میں اس چیز کا تصور ہی نہ ہوتا......''۔

''کس بات کا تصور؟'' شمع نے بارہ بارس کی اپنی منّی سی دکھائی دینے والی پیاری سی بہن کی باتوں سے پریشان ہو کر پوچھا۔ مگر منی آج بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کو بڑھائے جارہی تھی۔

''تب تم چپ چاپ سچائی کو قبول کرلیتیں!''

''کیسی سچائی؟''

''اخبار، رسالے، ٹی وی، کمپیوٹر، اسکول کالج بکواس کرتے رہتے ہیں...... گھر کی چہار دیواری میں پہنچ کر ہم صرف عورت ہیں نا......اور کچھ نہیں نا...... محکوم، مظلوم......!''

''کیا کہہ رہی ہو منی، خبر بھی ہے!......امی......!'' شمع ابھی سے اپنے ذہن میں پلنے والی خرافات منی کے ذہن میں پنپتا نہیں دیکھنا چاہتی تھی، لیکن منی نے اپنی بات پوری کہہ گزرنے کی ٹھان لی۔

''اور آزادی کا لیبل پیشانی پر لگا کر پنجرے میں رہنا کتنا مشکل ہے نا باجی!!''

شمع چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ یہ اس کی اپنی سوچ اور تجربہ ننھی سے منی کے ذہن میں چھ سات سال پہلے ہی کیسے پنپنے لگ گیا۔! اور پھر اتنی پختگی کے ساتھ!!!! شمع نے سوچا۔

''......یہی سوچ رہی ہو نہ باجی تم؟؟'' منی نے اسے جھنجھوڑا۔

رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ گھر میں اندھیرا کردیا گیا تھا۔ شمع کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔ بلڈنگ کے باہر رسی پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ گلی میں ٹریفک کم ہوچکی تھی۔ پرانی ممبئی کے بھیڑ بھاڑ والے علاقے کے جالی محلے میں لکڑی کا سامان بیلن تختہ، ابرائی، چمچوں وغیرہ کی دوکانیں بھی بند ہوچکی تھیں۔ بیسٹ کی ایک لال بس گلی سے اکا

دکا مسافر کو لے کر گزر رہی تھی۔ شمع نے گردن کھڑکی سے باہر نکال کر جھانکا۔ کھتری مسجد کے آگے راستہ پائدھونی کی جانب نکل رہا تھا۔ اندرونی گلیوں سے نئی بنی ہوئی ایک ٹاور بلڈنگ سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دوسری جانب نل بازار کی ہماہمی خاموش تھی۔

”خدا کی دنیا بہت وسیع ہے“

شیراز:۔

شیراز نے آفس میں سامنے پڑی فائلوں کو پرے سرکایا اور دراز سے ڈائری نکال کر ڈسٹر سے صاف کیا۔ وہ ڈائری کی کھردری سطح پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ چاکلیٹ رنگ کی اس ڈائری پر سال کی نشاندہی نہیں تھی۔ اس نے ڈائری کھولی۔ چند صفحات پر کچھ پیراگراف لکھے تھے۔ وہ آخری صفحے پر پہنچ کر رک گیا۔ اُس کے پین کی نیلی سیاہی نے آج کی تاریخ لکھ دی۔

”ناہید سے ملاقات ہوئی، تب میری بیوی کو مرے چند ماہ گزر چکے تھے۔ ان دنوں میں بہت اداس رہا کرتا تھا۔ بلکہ کسی حد تک احساس کمتری کا شکار۔ آخر میری کمزوری ہی تو میری بیوی کی موت کا سبب بنی تھی۔ مجھے معلوم تھا میری ماں اور بہن بہت چالاک اور جھوٹی ہیں مگر جب شام کو دفتر سے تھکا ہارا گھر لوٹتا تو چائے کے ساتھ ساتھ مجھے ان دونوں کی زہریلی شکایتیں بھی حلق سے اتارنی پڑتیں۔ ان دنوں میں جس کمپنی میں کام کیا کرتا تھا وہاں مجھے ہر وقت چیف انجینئر کی بکواس برداشت کرنی پڑتی تھی۔ گھر لوٹتا تو سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہ آتا۔ آخر دونوں کی تسکین کے لیے اسے بلوا بھیجتا۔ اس کے سامنے بات ہوتی تو وہ یوں متعجب نگاہوں سے ایک ایک کا منہ تکتی جیسے کسی فلم کا سنسنی خیز حصہ دیکھ رہی ہو۔ پھر اُس کی طرف سے جواب نہ پا کر، مجھے اسے ہی صلوٰتیں سنانی پڑتیں۔ مجھے غصہ اس بات پر آتا کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی اتنی بے زبان بننے کا ناٹک کیوں کرتی ہے؟ جبکہ مقابلہ ایک

ان پڑھ ماں بیٹی سے تھا! ایسے میں اُس کی خاموشی مجھے زہر لگتی۔ ایک بار تو اُس پر میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا تھا۔ پھر میں ان شکایات سے دور، باہر وقت گزارنے لگا۔ مگر مجھے پتہ نہ تھا کہ ان باتوں سے ان دونوں کو اتنی شہ ملے گی۔

چھٹی کا دن تھا۔ میں حسب معمول سویرے ہی گھر سے نکل پڑا۔ دن بھر آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس روز اچانک ضمیر نے سرگوشی کی۔ شام سے پہلے گھر لوٹا تو میرے ہاتھوں میں سلک کی خوبصورت ساڑی تھی۔

''بدرالنساء!!'' وہ شاید سو رہی تھی کیوں کہ سسک نہیں رہی تھی۔

''بدر!!'' میں نے قریب جا کر اسے گدگدایا مگر وہ نہ جاگی۔ چہرے سے پلو ہٹا کر دیکھا تو سن رہ گیا۔ اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں بے نور......! میری جاہل ماں اور بہن نے اسے زہر دے دیا تھا۔

میں نے ناہید کو یہ ساری داستان کہہ سنائی۔ اس نے مجھے بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھا اور چائے پیے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

اس واقعے کو برسوں بیت چکے ہیں۔ آج ناہید میری بیوی ہے۔ اس کا طمانیت سے بھرپور چہرہ، اس کا پرکشش جسم اس بات کے غماز ہیں کہ میں نے ہمیشہ ہی مسرت کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہے۔ اس کے دامن کے کانٹے میں نے چن لئے۔ ناہید روح بن کر میرے جسم میں سما چکی ہے۔ ہم دونوں نے بڑی محبت سے ایک چھوٹی سی کائنات آباد کی ہے، جس میں مہتاب بھی ہے، کہکشاں بھی ہے، آفتاب بھی اور شہاب بھی۔ مہتاب ہماری دھرتی کا چاند ہے کیوں کہ اس نے ہمیں پہلی بار ایک نئی تڑپ سے آشنا کروایا، ہمارے درمیان ایک نئے رشتے کو پروان چڑھایا۔

آج کل ناہید اداس سی رہتی ہے۔ ہمارے دھرتی کے چاند کو گہن جو لگ گیا ہے۔ میں اُسی گہن کو دور کرنے جا رہا ہوں۔ وہاں، جہاں میں کسی جنم میں جانا پسند نہ کرتا۔۔۔ یعنی میری ماں کے گھر، جہاں میری بہن، ایک عدد شوہر، بیٹیوں، دامادوں اور نواسوں کی ریل پیل میں زندگی گزار رہی ہے۔ اچھی یا بری...... میں نے کبھی خبر لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مگر

اپنی مہتاب کی خاطر مجھے وہاں جانا ہی ہوگا۔

سمن مہتاب جو کسی دیمک زدہ لکڑی کی طرح تیزی سے کھوکھلی ہو رہی ہے۔

میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں، محبت کرنے والی بیوی، ذہین ہونہار بچے، بنگلہ، کار۔ آج میں سپرنٹنڈنگ انجینئر ہوں۔ عزت، دولت اور سب سے بڑھ کر محبت ...... میں جب جب اپنی موجودہ زندگی پر غور کرتا ہوں میرا سینہ فخر سے اونچا ہو جاتا ہے مگر اس سینے میں ایک پھانس بھی چبھی ہوئی ہے۔ مہتاب کے زخموں کی کسک مجھے ہر وقت تڑپاتی رہتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لگی مہریں مجھے رہ رہ کر کسی کی یاد دلاتی ہیں۔ بے چاری مشرقی لڑکی! بے زبان گائے کی طرح جس کھونٹے سے باندھا، بندھ گئی۔ اور مشرقیت کی قربان گاہ پر بے دردی سے قربان بھی کردی گئی۔ آج میں اس قابل بھی نہیں کہ کسی کو دوش دے سکوں۔ میں تو قاتلوں کو سزا دینے کے بھی قابل نہیں۔"

شیراز نے کھلی ہوئی ڈائری پر سر رکھ دیا۔ پین اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر ٹیبل کے نیچے بچھے قیمتی قالین پر آرہا۔

ناہید:۔

ناہید نے سرہانے کی ننھی بیڈ لائٹ جلادی۔ آج رات کے تیسرے پہر ہی اُس کی آنکھ کھل گئی تھی اور کوشش کے باوجود پھر سو نہ سکی تھی۔ آخر اُس نے پلنگ کے بازو کھلے ٹیبل کے شیلف سے اپنی ڈائری نکال لی۔ قریب لیٹے شوہر کی پیشانی پر جھولتی لٹ کو سر کے بالوں میں ملا دیا اور ڈائری کھول کر لکھنے لگی ......

"اف! یہ مرد ذات بھی کیا چیز ہے؟

گھڑی میں مخلص ترین...... گھڑی میں بیگانہ!

شیراز صاحب کیا یوں ہی خیالات کے ریلے میں بہتے رہیں گے؟

کیا اپنے دکھ مجھ سے نہیں بانٹ سکتے!

ایسی ہی تو ہوں!

اک تمہاری خاطر ہی تو سب کو چھوڑا۔

ماں باپ خلاف، بھائی مخالف کہ اس بزدل سے شادی نہ کرو۔ مگر میں تو جیسے تمہارے دکھوں کے انبار تلے دب چکی تھی۔

شاید اسی کو عورت کہتے ہیں!

ایک دردمند محبت بھرا دل

مخلص

جذباتی

اور اسی جذباتیت اور محبت کی خاطر۔

کسی کے لئے آگ

کسی کے لئے پھول

ہاں اسی لئے تو۔۔۔ بھائی اور بیٹے کی محبت میں ان کی ماں بہنیں اُتاولی ہوئیں ...... کہ مرد کی اپنی بیوی سے محبت کے تصور ہی کو برداشت نہ کر سکیں۔

شاید اسی کا نام عورت ہے!

خیر چھوڑو...... میں بھی کہاں کی لے بیٹھی!

مجھے تو انہوں نے شروع ہی سے اُس گھر میں نہیں رکھا۔

سمن مہتاب کی پیدائش پر وہ آئیں بھی، ڈھیر سارے ننھے، منھے کھلونے لے کر...... مگر وہ ان سے ملے نہیں۔ مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ کھانے پینے اور آرام کا انتظام کروایا مگر اس طرف گئے بھی نہیں۔ مجھے بھی ملنے نہ دیا۔

تین دنوں کے انتظار کے بعد وہ دونوں چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا ماں جی کا انتقال ہو گیا۔ فرمانبردار بیٹے کی بے رخی شاید ان سے برداشت نہ ہو سکی ہو گی!

وہ میت میں گئے مگر کھڑے کھڑے لوٹ آئے۔ اپنے کسی جذبے کا اظہار تک نہ کیا۔ بہن بہنوئی پھر بھی ان کے لئے اجنبی ہی رہے۔ اور آج شام ...... وہ اسی بہن سے ملنے جا رہے ہیں۔

میں جانتی ہوں یہ آنکھیں سوچوں میں کیوں غرق ہیں۔ کیا میں ان میں چھپے جذبات کے مدوجزر کو پڑھ نہیں سکتی! آخر پچیس سال اسی میں تو گزرے ہیں۔

سمن مہتاب کی زندگی کو تو برباد ہونا ہی تھا، ہوگئی۔ میں بڑی مشکل سے اس کے زخموں پر پھایا رکھ پائی ہوں، ہوسکتا ہے یہ میری خام خیالی ہی ہو! بہرحال سمن نے بی ایڈ میں داخلہ لے ہی لیا۔

مگر شیراز!

وہ تو سنبھلتے ہی نہیں۔

دل کا روگ لگا بیٹھے ہیں۔

کل انہوں نے مجھ سے اپنی بہن بہنوئی اور ان کے آدھے درجن بچوں کے لئے کپڑے خریدوائے ہیں۔

بھلا خون کے رشتے بھی کہیں ٹوٹتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

ناہید نے اپنی ڈائری سرہانے رکھ دی۔ شیراز کو محبت سے دیکھا۔ اُس کی پیشانی پر بالوں کی لٹ پھر ایک بار جھولتی نظر آرہی تھی۔ اُس نے سرکش لٹ کو چھوا اور بیڈ لائٹ بجھا دی۔

سورج دیوتا ساری دنیا کے رنج وغم اپنے داغدار سینے میں چھپائے دور پہاڑیوں کے پیچھے پناہ گزیں ہو چکا ہے۔ چودھویں کا چاند بادلوں کے آنچل میں مچل رہا ہے۔ سڑک کی ہماہمی ختم ہو چکی ہے۔ سونی سونی سڑک پر کالی فئیٹ کار تیز چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ رک جاتی ہے اور اس میں سے ایک باوقار مرد باہر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر کئی دنوں کی تھکن عیاں ہے۔۔۔۔ یہی تو شیراز ہے۔

سپرنٹنڈنگ انجینئر

شہر کا باوقار شخص

ناہید کروٹ بدلے سو رہی ہے۔ اس کا چہرہ دیوار کی جانب ہے۔ شیراز سوٹ بوٹ سے آزاد ہلکی پھلکی لنگی کرتے میں ملبوس ہو چکا ہے۔ آج شیراز کا ذہن سخت پراگندہ

ہے۔اس نے کمرے کی مدھم بتی بجھادی ہے۔اسے سکون بخش نیند کی ضرورت ہے۔کل اس کا تبادلہ ہونے والا ہے۔اسی سلسلے میں اسے کچھ ضروری کاروائیاں پوری کرنی تھیں۔اس شہر سے بھی اس نے جلدی تبادلہ کروالیا ہے۔

اندھیرے میں یادوں کے دئے سورج کی طرح اجالا دینے لگتے ہیں۔سمن مہتاب اس کی آنکھوں میں سمائی جارہی ہے۔وہ اپنی گود میں ایک نرم گرم وجود کو محسوس کرتا ہے جو کبھی اس کے کندھوں پر سوار ہوجاتا ہے۔وہ تھک جاتا ہے،مگر اسے نہیں اتارتا۔

بچپن کے دن گزرے تو مہتاب پھول کی طرح کھل اٹھی۔کالج میں اس کے حسن کے چرچے تھے،اوراس سے زیادہ اس کی ذہانت کے۔

'اف! میری سوچیں کہاں کہاں بھٹکنے لگیں۔' شیراز کروٹ بدل بدل کر اپنے خیالات کی برف کو جمنے سے روکتا رہا مگر مہتاب اس کے ذہن سے الگ نہ ہوئی۔اس کے خیالات کے دامن سے لپٹی ہی رہی۔اور رات ہے کہ سرکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

شیراز اٹھ بیٹھا۔بٹن دبتے ہی کمرے میں ہلکی دودھیا روشنی نے بسیرا کرلیا۔اس نے الماری سے سرخ ڈائری نکال لی۔سرخ مارکر والے صفحے کو کھولا۔چھ سال پرانی تاریخ اس کے ہاتھوں میں تھرتھرانے لگی۔

''ڈیر ممی''

کچھ پھولوں کی قسمت میں کھلنا نہیں ہوتا۔آپ نے میرا نام تو سمن مہتاب رکھ دیا مگر میری قسمت کو نہ بدل سکے۔

اظہر دورے پر گئے ہوئے ہیں۔میری نندیں اور ساس سسر ایک رشتہ دار کی شادی میں گئے ہوئے ہیں،صبح لوٹیں گے۔آج کی رات میری سوچوں پر کوئی پابندی نہیں۔مہینوں کے انتظار کے بعد یہ فیصلہ کن رات آئی ہے۔آج کی رات ہی تو مجھے فیصلہ کرنا ہے۔

آپ صرف میری ماں ہی تو نہیں،میری سہیلی بھی تو ہیں۔میں کس کے سامنے اپنے ماضی کو دہراؤں۔اپنی تین سالہ زندگی کے بوسیدہ اوراق تو بس میں آپ کے سامنے ہی پلٹ سکتی ہوں۔آپ ہی میری رازدار بھی ہیں دمساز بھی۔

تین سال پہلے میں ایک ہنستی مسکراتی بی۔ایس۔سی کے آخری سال کی ذہین طلبہ تھی۔امتحانات ختم ہوئے اور ڈیڈی کے انجینئر دوست کے بزنس مین بیٹے سے شادی کی بات چلی۔ارشد کا مستقبل امریکہ میں روشن تھا۔اس کے والدین وہیں تھے۔اور ڈیڈی مجھے اپنے سے اس قدر دور نہیں کر سکتے تھے۔۔۔۔ڈیڈی نے اور میں نے، ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کی خاطر اپنے جذبات کی قربانی دے دی۔

سلیم کو شادی کی رات جب پہلی بار دیکھا تو وہ واقعی کسی شہزادے کی طرح نظر آیا۔اس نے مجھے بھی اسی شاہی ماحول میں رنگ دینا چاہا۔ میں نے انکار کر دیا تو گھر سے باہر رہنے لگا۔ ہفتے،عشرے گھر آتا۔آدھی سے زیادہ رات شراب کی بوتل میں ڈبو دیتا اور مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش رہتا تھا۔

میں نے سب کچھ برداشت کیا۔۔۔۔صرف ڈیڈی کی خاطر مگر شاید ڈیڈی ہر بات سے باخبر تھے۔ایک روز ڈیڈی امریکہ آئے اور بہانے سے مجھے گھر لے آئے تو طلاق کا طوق میرے گلے میں پڑا ہوا تھا۔۔میں نہیں کہتی کہ یہ طوق ڈیڈی نے ڈالا۔وہ یہ نہ کرتے تو میں گھل گھل کر مر چکی تھی!

آپ نے میری زندگی کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی۔ مجھے بی۔ایڈ میں داخل کرا دیا۔میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے کے لئے آپ نے کیا کچھ نہیں کیا! میں نے بھی رفتہ رفتہ اپنا ماتمی چولا اتار پھینکا۔

ایک سال سکون سے گذر گیا۔

وقت نے میرے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔

میں بھول ہی گئی کہ شادی شدہ زندگی کے چند اذیت ناک ماہ گزار چکی ہوں۔ میں کنواری سہیلیوں میں رہ کر اپنے کو کنواری ہی سمجھنے لگی، گو میری آنکھوں میں کنوارے سپنے پھر کبھی نہ جاگے۔

شادی ایک ہیبت ناک آسیب بن کر میرے ذہن پر سوار تھی، مگر ڈیڈی میرے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور قہقہے بکھرتے دیکھنا چاہتے تھے۔وہ احمد آباد گئے۔صرف میری

خاطر اپنی بہن سے ملے۔ وہ بہن، جس سے وہ نفرت ہی کرتے آئے تھے۔۔۔ شدید نفرت۔ میری خاطر ہی تو انہوں نے پھوپھی جان کے گھر بھر کو تحائف سے نوازا کیونکہ اسی شہر میں ان کو، مجھے بسانا تھا۔

اظہر بے انتہا انسان ہیں۔ اتنے نیک کہ ماں بہنیں ان کے منہ پر ان کی بیوی کو برا بھلا کہتی ہیں، کوستی ہیں مگر وہ اف تک نہیں کرتے۔ چپ چاپ خلاؤں میں گھورتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتے! محبت ہی کرتے ہوں گے۔ تبھی تو شکایت ایک طرف، وہ مجھے کچھ نہیں کہتے! اسی لئے تو وہ دونوں بوکھلا کر لہجے کو اور بھی کسیلا بنا لیتی ہیں۔

کل پھوپھی جان بڑی آپا کے ساتھ آئیں، میرے سر پر ہاتھ پھیر گئیں۔ پھر میری ساس کے پاس دیر تک بیٹھی رہیں۔ وہ پھوپھی جنہیں ڈیڈی نے میرا میکہ قرار دیا کہ احمد آباد سے چندی گڑھ دور ہے اور جس کا معاوضہ بھی وہ پاتی رہی رہیں۔ تعجب ہے میری دشمن کیسے بن گئیں! ان کے جانے کے بعد میری ساس ہمارے کمرے میں آئیں۔ اظہر بیٹھے آفس کی فائلیں دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگیں،

''میں نہ کہتی تھی اظہر بیٹے یہ ڈائن، اس گھر کے سکون کو برباد کر کے رہے گی۔ دیکھ تو بیٹا اسی کی پھوپھی، اسی کا خون آج سارے راز فاش کر گئی۔ اس کی ماں نے ان لوگوں کا گھر بانٹ دیا۔ ماں سے بیٹے کو، بہن سے بھائی کو جدا کر ڈالا۔ ارے یہ کیا نبھے گی! نبھ سکتی تو پہلا رشتہ نہ نبھا لیتی۔ دن بھر خالی بیٹھی رسالے الٹتی رہتی ہے۔ اِس کے باپ نے بزنس شروع کروا دیا، سمجھتی ہے، خرید ہی لیا۔ ہم سے بات چیت کرنا بھی جیسے عیب ہے اس کو! پڑھی لکھی جو ٹھہری! تیرے آنے کے وقت صفائی ستھرائی میں لگ جاتی ہے۔ میری حنیفہ، بشیرا کو دیکھو سارے چھوٹے بڑے کام نپٹا کر شام تک صاف ستھری کیسی چمک جاتی ہیں۔ اتنی ذرا سی عمر میں کیسا سلیقہ پایا ہے،'' وہ رکے بغیر کہتی رہیں، ''میں تو کہتی ہوں اس روز روز کی کھٹ پٹ سے دوسرا بیاہ ہی کر لے! تیرے ماموں تو ابھی بیٹی دے دیں۔ بس ذرا تیری ممانی کی ہی ناراضگی تھی۔ اب وہ بھی نہیں رہیں نا! رہنا ہو تو پڑی رہے یہ بھی ایک کونے میں، بس گنتی میں نہ رہے۔ بس ظلم نہ کرے ہم پر...... الگ نہ کرے ہمیں تجھ سے...... ارے!

اس کی پھوپھی پر اس کی ماں نے بڑا ظلم کیا۔ اب کیا یہ نگوڑی میری جان لے کر رہے گی! بڑی منتوں کی اولاد ہے رے تو! چار چار کنواری بیٹیاں پڑی ہیں میری..!'' اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

میں نے اپنی مختصر زندگی میں ٹھوکریں کھا کر بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ کالج کے دنوں سے ہی معتبر رسائل میں میرے افسانے چھپتے رہے ہیں۔ اظہر کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اظہر کو میں کبھی روحانی سطح پر قبول نہیں کر سکی ہوں۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں، ایسی بات نہیں بلکہ ان میں وہ نفاست نہیں، جو انسان کی زندگی نکھارتی ہے۔ فائن آرٹس سے دلچسپی کیا ہوتی ہے اُنہیں نہیں معلوم۔ خود مجھے اس فن سے الفت کیوں ہے، اس بارے میں وہ سوچ تک نہیں تک سکتے۔ ان کے تقاضے الگ ہیں اور میرے اور، جس کی تسکین اُن کے گھر میں نہ ہو سکی۔ دونوں ہی خاوندوں کی رفاقت سے مجھے میرے ذہن و جذبات کے تقاضوں کی تسکین نہ ملی۔ کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگ بس ساتھ رہنے بھر کے لئے رفیقِ حیات ہوتے ہیں۔

اظہر نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ دیر تک ماں کو سمجھاتے، دلاسا دیتے رہے۔

میں جان جا چکی ہوں، مارتے مارتے پتھر نشانے پر جا لگا ہے۔ اور پھر اظہر!

یوں تو وہ میرے سب کچھ ہیں مگر پھر بھی، کچھ بھی تو نہیں۔

ماں بہنوں کی شکایت کروں، تو انہیں گالی لگتی ہے۔ میں کس برتے پر کسی کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں کڑوی باتوں کے زہر پیتی رہتی اور وہ بڑے اطمینان سے بیٹھے حلق سے نوالے اتارتے رہتے، جیسے پرایوں کا قصہ ہو۔ میں تو جیسے ان کی کچھ بھی نہیں۔

اب میں کس پر اعتماد کروں؟

کس کو ہمراز بناؤں؟؟

کس کو اپنا جانوں؟؟؟

اس شوہر کو جس نے مجھے ہمیشہ ہی اپنی ماں کی بہو سمجھا، اپنی شریک حیات، اپنی

ذمہ داری کبھی نہ سمجھا۔

اس ساس کو

جنہیں ہمیشہ ہی یہ خدشہ رہتا کہ کہیں بیٹا، بہو سے محبت نہ کرنے لگے۔

ان نندوں کو

جو میری بہنیں نہ بن سکیں، رشتے کی روایت ہی نبھاتی رہیں۔

یا ان پھوپھی کو

میں جن کے بھائی کی نہیں، بھابی کی اولاد ہوں۔

اچھا ہی ہے کہ میں چپ ہوں۔

آج کی رات مجھے اکیلے ہی کاٹنی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے پردے لہرا رہے ہیں۔ میں اپنے بستر میں پڑی اپنی مختصر سی زندگی میں پڑی گرہوں پر غور کر رہی ہوں کہیں سے کھینچوں، گرہیں اتنی مضبوط ہیں کہ تاگہ ٹوٹ جائے گا، گرہیں نہیں کھلیں گی۔ اتنا تو میں جانتی ہی ہوں کہ اظہر کو میں اپنا نہیں بنا سکی، نہ خدمت سے، نہ محبت سے۔ بس گھٹ گھٹ کر زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں یہ بھی بھول چکی ہوں کہ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔ ایک نامور باپ کی بیٹی مگر آج مجھے شدید احساس ہو رہا ہے۔

اپنی قابلیت کا۔

اپنی بے بس جوانی کا

میں نفرت کرتی ہوں اس ذات سے جس نے میری شخصیت مسخ کر کے مجھے بوتل میں قید کر کے محفل میں سجا دینا چاہا۔

مجھے نفرت ہے اس ذات سے بھی، جس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر مجھے شریکِ حیات بنایا مگر اپنی ذمہ داری کبھی نہ سمجھا۔

میں دونوں ہی مرتبہ ایک بیوی رہی۔ ایک انسان کی حیثیت سے میں کچھ بھی تو نہ رہی۔

مجھے مرد کی ذات سے ہی تو نفرت نہیں۔

میں تو عورت ذات کے اُس روپ سے بھی نفرت کرتی ہوں جو مکاری اور خود غرضی میں شیطان کو شرمندہ کر دے۔

عورت کے اُس روپ سے بھی

جو محبت کی دیوی کہلاتی ہے۔

زمانے بھر میں محبت، دان کرتی پھرتی ہے مگر جب ساس اور نند بن جاتی ہے تو حاکمِ وقت میں تبدیل ہو جاتی ہے، ایک بپھری ہوئی ناگن بن جاتی ہے۔ مسکراتے ہوئے پھولوں کو خاکستر کر دینے والا شعلہ بن جاتی ہے۔

آج میری انا جو زندگی کے بے رحم ہاتھوں سے کوڑے کھا کھا کر بے ہوش ہو چکی تھی، اپنے حواس دوبارہ پا چکی ہے۔ آج مجھے یہ گھر جہنم نظر آ رہا ہے۔

ہر پھول کو باغبان میسر نہیں آتا

مگر زندگی بڑی خوبصورت ہے، اُسے بے رحم مالی کے سفاک ہاتھوں کے سپرد نہ کرنا چاہئے ورنہ یہ جل کر بھسم ہو جائے گی۔

میں وہ سمن ہوں جس کو کوئی مالی راس نہ آسکا۔

تب کیوں نہ میں ایک خودرو پودے میں تبدیل ہو جاؤں! کیوں نہ اپنی جڑوں کو اتنی دور دور تک زمین کی گہرائیوں میں پھیلا دوں کہ مجھے پانی کی ایک ایک بوند کے لئے آسمان کا محتاج نہ ہونا پڑے!

میں ڈیڈی کی آنکھوں میں اپنے کو لمحہ لمحہ سسکتا نہیں دیکھنا چاہتی۔ شاید اُنہیں اظہر میں اپنا اور مجھ میں اُس مظلوم ہستی کا سراپا نظر آتا ہے، جس نے اُن کی بے توجہی کی شکایت تک نہ کی۔

میں نے کھڑکی سے پردے ہٹا دئے ہیں۔ پو پھٹ رہی ہے۔ آسمان کا نظر آنے والا حصہ، میٹھے گلابی شربت سے بھرا پیالہ بن چکا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آسمان کی حدوں کا اندازہ لگا رہی ہوں۔

خدا کی دنیا بہت وسیع ہے۔"

شیراز نے سمن مہتاب کی ڈائری کو آنکھوں سے لگالیا، اُسے چوما اور دوبارہ اپنی جگہ الماری میں رکھ دیا۔

''تم کہاں ہو؟؟'' اپنا سینہ تھام کراس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' بیوی کی آواز پر وہ پلٹا اور چونک کر اُس سے پوچھا۔''ہاں''؟

''پتہ ہے آپ نے کیا کہا ابھی ابھی؟'' ناہید پوچھ رہی تھی، ''کس کو آواز دی؟''

''کچھ کہا کیا میں نے؟''، شیراز نے حیرانی سے سوال کیا،۔''میں تو سمن مہتاب کی ڈائری پڑھ رہا تھا! کیسے سوال کر رہی ہو؟......!'' وہ ہکلانے لگا۔

''چھ برسوں سے آپ بیٹی کی یاد میں خود کو بھلائے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں بھی رہے گی، خود کو سنبھالے رہے گی۔ وہ میری بیٹی ہے...... آپ کو ایک اچھی خبر دیتی ہوں۔ مہتاب کی سہیلی جولی کا فون آیا تھا، کہہ رہی تھی، مہتاب......''۔

''اچ...... چھا؟؟؟'' شیراز اچھل پڑا۔''کہاں ہے میری بچی؟؟؟'' بیوی کی بات پوری طرح سنے بغیر ہی وہ بول پڑا تھا۔

''وہ پنچ گنی میں سینٹ پیٹرس ہائی سکول میں پڑھا رہی ہے اور وہیں لڑکیوں کے ہاسٹل کی میٹرن ہے۔'' بات سنتے ہی شیراز پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد جب دل کا غبار ہلکا ہوا تو ناہید نے اس کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''راتوں کی تنہائی میں جب بھی آپ سمن مہتاب کو یاد کرتے ہیں......، میں نے آپ کو نہیں بتایا......، آپ کے منہ سے نکلا ہے،...... 'بدرالنساء! تم کہاں ہو!' ......''

شیراز آنکھیں پھاڑے ناہید کو دیکھ رہا تھا۔

''اپنے آپ کو معاف کر دو شیراز!!'' ناہید اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

☆☆

پہلی بیوی

اِس بار بارشیں دسمبر تک چلیں۔ بارش ختم ہوتے ہی اچانک موسم ٹھنڈا ہو گیا۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے میں نے کالج چھوڑا۔ گھر کے راستے میں پکّی سڑک سے نیچے اُترتی ایک چھوٹی سی سیڑھی سے اتر کر تنگ گلی سے ہوتی ہوئی، میں اپنے گھر کی جانب مڑی۔

'آج گھر جلدی جا کر جھاڑ پونچھ کرنے والی بائی کے آنے سے پہلے ذرا آرام کرلوں گی۔'، میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ گلی میں پکّی عمروں کا مرد عورت کا جوڑا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ مرد نے سفید ملگجا سا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ عورت کی ہلکی نارنجی لہریا ساڑی کمر میں کسی ہوئی تھی، اس کی کھلی رنگت پر مدھم سی مسکراہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے مرد کی ہتھیلیوں میں کپڑے کی ایک پوٹلی دیکھی۔ مجھے اس میں ایک آدھ دن پہلے پیدا ہوئے بچّے کا گُمان ہوا۔

''ارے اتنے چھوٹے بچّے کو کہاں لئے جا رہے ہو؟ کس کا ہے یہ؟''، میں نے ان سے پوچھا۔ اُن دنوں بچہ چوروں کی افواہ زوروں پر تھیں۔

''ذرا دکھانا تو!'' مرد اور عورت چلتے چلتے رک گئے۔ مرد نے اپنی ہتھیلی نیچی کر کے بچے کا چہرا دکھایا۔ ننھا فرشتہ ٹکر ٹکر آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ موٹی سی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، گہرے گلابی ہونٹ، گورا چِٹا، نوزاد......

''ساتویں مہینے کا ہے؟'' میں نے اندازہ لگایا۔

''ہاں۔''

''کہاں لئے جا رہے ہو؟''

''کل رات ایک بجے اِس کے بچہ ہوا۔'' مرد اپنے ساتھ والی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بول رہا تھا، جو مفلر جیسا کوئی کپڑا اپنے کانوں پر لپیٹ رہی تھی۔

''اسپتال میں ہوا؟''، میں نے پوچھا۔

''نہیں گھر میں...... ابھی سرکاری اسپتال لے گیا تھا، دکھانے کو۔''

''سب ٹھیک تو ہے؟''

''بچہ کمزور ہے۔ اس کو کانچ میں رکھنے کو بولا ہے۔''

''نگر پالیکا اسپتال میں انکیوبیٹر نہیں ہے کیا؟''

''نہیں ہے۔''

''پھر!!!''، میں نے افسوس کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے گاؤں، دیہات ہیں، وہاں کیا ہوتا ہوگا! یہ خیال مجھے پریشان کرنے لگا۔

''ڈاکٹر نے چٹھی دے کر بکری کے سامنے والے اسپتال میں بھیجا ہے۔''، اس نے جواب دیا۔

''سیتارام اسپتال؟''

''ہاں۔''

''پھر رکھا کیوں نہیں؟''

''وہاں کی ڈاکٹرنی بولتی ہے، روز کا دو ہزار روپیہ لگے گا۔''

''کتنے دن رکھنا ہوگا؟''

''پندرہ دن۔''

''.........''

''ڈاکٹرنی بولتی ہے، تیس ہزار روپیہ جمع کرادو۔ پندرہ دنوں میں بالکل اچھا بچہ ہاتھ میں دوں گی۔''

''رکھا کیوں نہیں؟''

''پیسہ کدھر ہے؟''

''......کیا کرتے ہو؟''

''پہلے بھنگار اٹھاتا تھا''۔

''اب کیا کرتے ہو؟''

''ردّی خریدتا ہوں۔''

''یہ کیا کرتی ہے؟''میں نے عورت کی جانب اشارہ کیا۔

''پہلے یہ کچرا چُنتی تھی......اب بھیک مانگتی ہے......منع کرتا ہوں پھر بھی سنتی نہیں۔''

''کتنے بچّے ہیں؟''

''بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ دوسری دس سال کی......تیسری پانچ سال کی۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''چلو ایک کام کرو۔''، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح ان کی مدد کروں!،''اتنی سخت سردی ہے......اتنا چھوٹا بچّہ......گھومنا ٹھیک نہیں نا!''

میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ کیا کہنا چاہ رہی تھی، کیا کہہ رہی تھی! ''گھر لے جاؤ نہیں تو یہ کیسے بچے گا!''، میری بات اور کہنے کا انداز انہیں عجیب لگا۔ دونوں میرا منہ تکنے لگے۔ مجھے بھی جھینپ ہوئی کہ، بچّے کو پیدا ہوئے ابھی ایک دن بھی نہیں ہوا کہ میں اس کے نہ بچنے کی بات کرنے لگی تھی۔ میں نے ان سے نظریں ہٹائیں اور کھڑے کھڑے سوچنے لگی۔

'کیا کروں؟......خالی انسانیت کی باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے! کچھ کیا نہیں تو یہ سچ مچ نہیں بچ پائے گا......کیا کروں؟'، ذہن میں تیزی سے سماج سیوا کرنے والے اداروں کا خیال آنے لگا۔

''میں کچھ کوشش کرتی ہوں۔''، میں نے اس سے کہا،''تم ایسا کرو، اپنی بیوی کی گود میں بچّہ دے کر اسے اس دیوار پر بٹھا دو اور میرے ساتھ چل کر میرا گھر دیکھ لو۔ لوٹ کر بیوی اور بچّے کو گھر چھوڑ کر میرے گھر آجاؤ......تب تک میں دیکھتی ہوں کہ میں تمہارے لئے کیا

کر سکتی ہوں۔''

وہ دونوں ایک دوسرے سے صلاح ومشورہ کرنے لگے۔ میں ذرا سا آگے بڑھ آئی تھی، پلٹ کر پوچھا،''تمہارا نام کیا ہے؟'' مجھے خیال آیا تھا کہ ان کا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔

''میں یوسف اور یہ میری بیوی صابرہ۔''

مجھے ان پر بڑا رحم آرہا تھا۔

''......میں اُس بچّے کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔'' گھر پہنچ کر اس نے اپنے شوہر کو فون کیا۔

''تو چلی جاؤ ان کے ساتھ کلمبولی کے ایم جی ایم اسپتال......ایڈمٹ کروا آؤ، مدر ٹریسا میڈم!'' وہ ہنسے۔

میں چپ ہوگئی۔تو انہوں نے بیوی کے موڈ کا اندازہ کیا اور بولے،

''اسپتال کا پتہ بتا دو اور کچھ پیسے دے کر ان کو بھیج دو۔''

''کیا وہ جا پائیں گے؟''

''یہ بھی مجھے ہی بتانا ہوگا؟''

''ہماری میونسپلٹی تو مہاراشٹر کی اے کلاس میونسپلٹی ہے نا!......پھر بھی ایک ڈھنگ کا اسپتال نہیں ہے۔''

''کیوں سرکاری اسپتال کے سامنے کی کھلی زمین نہیں دیکھی کیا؟ وہاں ایک ہائی فائی اسپتال بنانے کے پلان کا نشان لگا ہوا ہے۔''

''رشوت خوری کے چکّر میں نہیں بنا ہوگا نا!''

''ایک انجینئر کا قتل ہونے کے بعد سے کام بند ہوگیا۔''

''تو آپ جیسے بزنس مین کیوں نہیں بنا لیتے، ایک اچھا اسپتال؟......علاج کے لئے لوگوں کو ساٹھ ساٹھ کلو میٹر کا سفر کرنا پڑتا ہے!'' وہ اس بات کو اتنے ہلکے پھلکے ڈھنگ

سے لے رہے تھے کہ مجھے ہی غصہ ہی آیا۔

''پھر تو وہ پرائیویٹ اسپتال ہوگا نا!......اور وہ بہت سے ہیں......جنہیں تم پتھر دل کہتی ہو!......کہوگی کہ غریبوں کے کام کے نہیں......ہے نا میڈم؟''

مجھے یاد آیا، سندر نام کا میرا ایک پرانا طالب علم، سرکاری اسپتال میں وارڈ بوائے ہے۔ میں نے اسے فون کیا اور حالت بتائی۔

''سندر، یہ لوگ بڑے غریب ہیں۔ سرکاری اسپتال میں آج کل کچھ نہ کچھ خرچ تو آتا ہی ہے۔ ان کی حالت......''

''آپ ایسا کیجئے۔ ان کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں ان کو چھٹی لکھوادوں گا۔ تو علی باغ کے سرکاری اسپتال میں بچّے کا علاج فری ہو جائے گا۔''

''کیسا اسپتال ہے یہ؟ وہاں انکیو بیٹر تو ہے؟''

''ہاں۔ اسی کے لئے تو وہ مشہور ہے۔''

''بچّے کو لانے کی ضرورت نہیں نا؟''

''اس کو چیک کر کے ہی چٹھی دیں گے نا!''

''وہ کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے بچّے کو چیک کروا کر لائے ہیں......اچھا کوئی بات نہیں میں اس کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔''

کوئی ساڑھے بارہ بجے یوسف بیوی بچے کو گھر چھوڑ کر لوٹا تو میں نے اسے ذرا سے شکایتی لہجے میں کہا ''بڑی دیر لگادی بھائی؟''، پھر میں نے ایک پیپر پر سندر کا پورا نام اور کام لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''......اب فوراً گھر جاؤ اور بیوی اور بچے کو لے کے سرکاری اسپتال چلے جاؤ۔ اس آدمی سے ملو اور چٹھی لے کر آؤ۔ پھر علی باغ کے سرکاری اسپتال میں تم اپنے بچے کا بنا پیسوں کے علاج کر پاؤ گے۔ وارڈ بوائے سندر سے چٹھی لے کر سیدھے میرے پاس آنا اور مجھ سے سفر وغیرہ کے پیسے لے کر فوراً علی باغ کے لئے نکل جانا۔''

یوسف چلا گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جا کر خود اس کی مدد کروں مگر بے بس تھی۔ کالج سے گھر لوٹ کر کھانا تیار کرنا اور بائی کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کرنی تھی۔ تین ساڑھے تین بجے سے پہلے تو میں بستر سے پیٹھ بھی لگا نہیں سکتی تھی۔ اِس پر اس دن میرا بھانجا کسی کام سے یہیں آیا ہوا تھا۔ اور کھانا ہمارے ساتھ کھانے والا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بچا ہوا کھانا چھوٹے برتن میں نکال کر میں نے فرج میں رکھا اور جھوٹے برتن بائی کو دے رہی تھی کہ ایک دم یاد آیا۔

''ارے عجیب آدمی ہے۔ ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ اب تک نہیں آیا''، فریدہ نے سندر کو فون لگایا۔

''میڈم میں اس کا رستہ دیکھ کر کھانا کھانے گھر چلا گیا تھا۔''

''ابھی نہیں آیا؟''

''نہیں''۔

''آجائے تو ذرا ایک مسڈ کال دے دینا۔''

''آپ ہماری ڈین ڈاکٹر سے بات کریں گی؟'' سندر نے پوچھا۔

''ہاں، کراؤ۔'' ڈین ڈاکٹر سے میں نے تفصیل سے بات کی تو وہ بولیں،

''اِس اسپتال میں انکیوبیٹر کی سہولت نہیں۔ علی باغ کے سرکاری اسپتال لے جانا ہی ٹھیک ہے۔''

''آپ کا اپنا اسپتال بھی ہے، اس میں انکیوبیٹر ہے؟''

''ہاں۔''

''اس کی فیس کیا ہے؟''

''میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔ میرے پتی ناسک گئے ہوئے ہیں۔ وہ بچوں کے ڈاکٹر ہیں۔ انہیں کو پتہ ہے۔''، ڈین ڈاکٹر نے شاید کنگال مریض سے بچنے کی کوشش کی تھی۔

شام چھے بجے میں نے دوبارہ سندر کو فون کیا۔ وہ بولا، ''میں ابھی آپ کو فون

کرنے ہی جارہا تھا۔ وہ ابھی ابھی میرے پاس سے علی باغ کے سرکاری اسپتال کے لئے سفارشی خط لکھوا کر لے کر گیا ہے۔''

''اچھا! اتنی دیر سے آیا؟''

''آپ نے کہا تھا، اسی لئے میں یہاں اتنی دیر تک رکا ہوا تھا۔ ورنہ کب کا نکل جاتا۔'' اس نے احسان جتایا۔

''شکریہ سندر۔'' وہ خوش ہوا، بولا۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ ایمبولینس لے کر نہ جائے۔ ہزار بارہ سو روپے لگ جائیں گے۔ بس سے جائے گا تو سو روپیوں میں پہنچ جائے گا۔''

''اچھا، اب وہاں سے نکلا ہے، تو سیدھے میرے پاس آئے گا...... لیکن ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔ اِس وقت بھیجوں یا کل صبح؟''

''صبح ہی بھیجئے۔''

''شکریہ سندر!'' میرے دل کو سکون آیا۔

اُس شام یوسف ~~فیکہ~~ کے پاس نہیں آیا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی۔ جی چاہا، کاجوواڑی کی جھونپڑپٹی میں جا کر اس کو ڈھونڈوں۔ کہا تو اس نے یہ تھا کہ پہاڑی شروع ہوتے ہی کچھ گھر چھوڑ کر اُس کا گھر ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ہمارے گھر سے اس کا گھر صرف دس منٹ کے فاصلے پر ہے، مگر اس وقت جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ رات کے وقت جھگی جھونپڑپٹیوں کے لوگ دن بھر کی مزدوری کے بعد تھوڑا یا پھر خوب پی کر گھر لوٹتے ہیں۔ میں نے دیسی دارو کی تیز بدبو اپنی سانسوں میں محسوس کی اور خود کو وہاں نہ جانے پر راضی کرلیا۔ پھر سوچنے لگی کہ کاجوواڑی کے کسی طالب علم یا اپنے شوہر کے کسی مزدور کو فون کر کے پتہ کرلوں۔ ایک لڑکی کا خیال آیا، جو کالج کے آخری سال میں تھی۔ دراصل ہمارا کالج کاجوواڑی کی پہاڑی سے بالکل سٹا ہوا ہے۔ کاجوواڑی، جنگلاتی علاقے میں آتا ہے.... یعنی سرکاری جائیداد! ووٹ بینک ہونے کی وجہ سے جب کبھی اس علاقے کو، جھونپڑیوں سے پاک کرنے کا پروگرام بنتا ہے، یہاں کی عورتیں بیلن لے کر نیتا

کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اور وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ ان کے گھر کو ٹوٹنے نہیں دیگا۔ پوری پہاڑی پر بنے ہوئے گھروں کی، پتہ نہیں کس طرح پٹے کی رسیدیں بھی موجود ہیں! یہاں کم سے کم دو ڈھائی سو گھر ہوں گے۔ کچھ لوگوں نے پکّے گھر بھی بنا لئے ہیں۔ ایسے پکّے گھر والوں نے مل کر اپنا ایک ذاتی پاخانہ بنالیا، جس کی ایک ایک چابی بھی وہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ باقی لوگوں کے لئے اس کا بندوبست ہائی وے کے قریب پرانے پولس سٹیشن کے پڑوس میں نگر پالیکا کے بنائے ہوئے شوچالیہ میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچّے پرانے ممبئی پونا ہائی وے کے کنارے کا جوواڑی سے لگی چھوٹی سی برائے نام سڑک پر صبح آرام سے فارغ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

''کیا کیا جائے؟'' میں نے اپنے شوہر سے پوچھا، ''بچّے کو پوری رات گھر میں رکھنا تو خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایک دو دنوں کے لئے اپنے یہاں کے ہی، دن کے دو ہزار والے اسپتال کے انکیوبیٹر میں رکھوا دیتے ہیں۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔ پھر پرائیویٹ اسپتال والے کسی نہ کسی بہانے کئی دنوں تک روکے رکھیں گے۔ تم تگڑی آسامی جو ہو!''

صبح تین بجے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بے چینی تھی۔ بچّے کو جلد ہی اسپتال پہنچانا تھا۔ 'کتنی خوشی ملے گی مجھے، جب اس بچّے کو ہنستا، کھیلتا، بڑھتا دیکھوں گی۔ ہمارے سماج میں بیٹوں کا پیدا ہونا کتنی خوشی لاتا ہے۔ کیسے عجیب لوگ ہیں! کیا اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی بیوی کے یہاں بچہ ہونے والا ہے کہ نو مہینوں میں اس نے کچھ پیسے نہیں جٹائے!'، میں نے پلان بنایا کہ صبح پہلے یوسف کے گھر جاؤں گی۔ روپئے دے کر انہیں جلدی نکلنے کو کہوں گی۔.... مگر صبح ہلکی سی ورزش کر کے، شوہر کے لئے ناشتہ تیار کرنے، خود تیار ہو کر ایک کپ چائے پی کر نکلتے نکلتے ساڑھے سات بج گئے۔ کالج کی پہلی گھنٹی پونے آٹھ بجے ہوتی ہے۔

'اِس وقت جاؤں گی تو کالج کے لئے دیر ہو جائے گی۔ اور پھر گھر ڈھونڈ نا بھی تو پڑے گا۔' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

چوتھا لیکچر فاؤنڈیشن کورس کا تھا۔ لیکچر میں صرف دو لڑکے موجود تھے۔ سپورٹس شروع ہو رہے تھے۔ اور اُس کے ادگھاٹن کا دن تھا۔ طلباء باہر پلے گراؤنڈ کی ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ لیکچر کے دوران میں نے دونوں سے اُس سات مہینوں میں پیدا ہونے والے بچّے کی بات کی اور کہا، ''یہ لوگ بے پرواہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پتہ نہیں اُن کو سمجھ میں آئے گا کہ نہیں! کس بس میں بیٹھیں، کس میں نہیں! تم لوگ میرے ساتھ چلو اور انہیں علی باغ کی بس میں بٹھا کر ہی اپنے گھر جاؤ۔''

میں دونوں لڑکوں کو لے کر یوسف کے گھر کی طرف نکل پڑی۔ گھر ڈھونڈھنے میں تکلیف نہیں ہوئی۔ یوسف نے بتایا تھا، کا جوواڑی کے چھوٹے سے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف اُن کا گھر تھا۔

وہیں ایک جھونپڑے کی عورت سے، جو بال بنا رہی تھی، میں نے پوچھا،

''یوسف کہاں رہتا ہے؟'' وہ کنگھی ہاتھ میں لے کر سوچنے لگی۔

''جس کے گھر پرسوں بچہ ہوا ہے......''۔ اس نے وضاحت کی۔ اس نے کنگھی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

میں آگے بڑھی۔ کا جوواڑی کے اس حصّے میں بے حد غریبی دکھائی دی۔ جھونپڑے ایک دوسرے سے لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان تنگ گلیاں تھیں۔ پہاڑی کے اس چھور پر جھونپڑے کے سامنے کچھ بچّے اور تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پیشانی پر بندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے مسلمان لگیں ورنہ تو وہ ساجھے کلچر کا نمونہ ہی تھیں۔ ان کے پیچھے ذرا سی دوری پر گندی چٹائیوں سے بنا کھلی چھت کا باتھ روم تھا، جس میں کوئی نہا رہا تھا۔ چٹائی کے نیچے سے صابن کا گندہ پانی پتھروں کے درمیان سے بہتا اپنا راستہ بناتا ہوا پہاڑی کی ڈھلانوں میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ بغل میں ایک چھوٹا سا ٹین کے پترے کی چھت اور بانس کی لکڑیوں کی دیواروں کا بنا جھونپڑا تھا۔ میں نے جھونپڑے میں سرسری نظر

دوڑائی۔ دیواروں پر مٹی لپی ہوئی تھی۔ دیوار میں لگے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے پر کچھ صاف دھلے چمچماتے برتن سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔ اُسی کے نیچے مٹی کا چولہا تھا جس کے پاس کچھ سوکھی لکڑیاں پڑی تھیں۔ جھونپڑے میں دروازے کے قریب ایک کھاٹ پڑی ہوئی تھی۔ کھاٹ کے پیچھے جھونپڑے کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہوا ایک پردہ رسّی سے باندھ کر لٹکا دیا گیا تھا۔

''بچّہ کیسا ہے؟''، میں نے یوسف کی بیوی صابرہ کو اسی کھاٹ کے پائنتی ایک پیر موڑ کر بیٹھے دیکھ کر پہچانا اور پوچھا۔ مگر صابرہ کے بجائے جھونپڑے کے باہر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے گھنگھریالے بالوں والی ایک موٹی سی عورت نے جو بے ترتیب سی ساڑی پہنے تھی جواب دیا۔

''مر گیا''۔

''کب؟؟''میری اندر کی سانس اندر رہ گئی۔

''آج صبح، چھے بجے''۔

فسیدہ افسوس سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

''کل تم گھر کیوں نہیں آئیں؟ میں نے صابرہ سے پوچھا۔ وہ چپ رہی مگر گھنگھریالے بالوں والی بولی،

''اِن لوگوں نے اسپتال کی چٹھی گُما دی۔ اور آپ کا گھر بھی نہیں ملا۔''

''گھر نہیں ملا؟''

''گھر تو میں نے یوسف کو دکھا دیا تھا۔''

''یوسف نے صابرہ کو آپ کے گھر کا راستہ سمجھا دیا تھا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صابرہ جائے مگر یہ تو......''

''تم کون ہو؟''، گھنگھریالے بالوں والی کے بار بار بات چیت میں حصہ لینے سے مجھے لگا، وہ یوسف کے گھر کی ہی ایک فرد ہے۔

''میں بھی یوسف کی عورت ہوں۔''

مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔

''ذرا بچّے کا چہرا دکھاؤ۔'' وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی یوسف کے گھر میں داخل ہوئی۔

کھاٹ پر پڑی ہوئی سفید چادر سرہانے کھسکا کر صابرہ نے مجھے بچّے کا چہرہ دکھایا۔ میرا دل بری طرح دھڑکا، 'کل یہ بچہ جس طرح دکھائی دے رہا تھا، یاد آیا، شاید زندہ رہنے کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے گال دب چکے تھے۔ رنگ سنولا ہو گیا تھا...... پاس پڑوس کتنا بے حس ہے!...... کہ ایسا تو ہو ہی رہتا ہوگا!'، میں نے دل میں سوچا۔

''تمہارا آدمی کہاں ہے؟''

''حافظ جی کو بولنے گیا ہے، میّت کے کام کے لئے۔'' گھنگھریالے بالوں والی بولی۔

تبھی اچانک، دو سال کا بچّہ تیزی کے ساتھ گھنگھریالے بالوں والی عورت کی جانب دوڑتا ہوا آیا۔ وہ پیر پسار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بچّے کو دیکھ کر اس نے فوراً آلتی پالتی مار لی۔ بچہ دوڑ کر اس کے پاؤں پر لیٹ گیا۔ اور وہ بچّے کو دودھ پلانے لگی۔ اُسے اپنے کپڑوں کی سدھ بدھ کہاں تھی! مجھے شرم محسوس ہوئی۔ اب میں اُس کے اور اپنے طلباء کے درمیان آ گئی۔ اس کے دل نے کہا، 'بچّے کو بچانے کے لئے کچھ پیسہ خرچ کرنا چاہتی تھی، وہی شاید اس کی میّت میں کام آ جائیں۔'

''میّت کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔''، میں نے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے صابرہ سے کہا۔

'نہیں...... میّت کے لئے پیسے مت دو۔ میں تو یہاں بیٹھی ہوں۔'' گھنگھریالے بالوں والی عورت کی بات سے میں اچنبھے میں تھی۔

''تم پہلی بیوی ہو یا دوسری؟'' میں نے پوچھا۔

''میں پہلی ہوں۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ یوسف کی دونوں بیویوں میں عمر یا شکل وصورت میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔

''تمہارے بچّے نہیں تھے، اِسی لئے اُس نے دوسری شادی کر لی؟''

''میرے مَرد کو اِس سے پیار ہو گیا تھا۔ اِسی لئے اِس کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ اس وقت تو میرا پہلا بچّہ میرے پیٹ میں تھا۔''

''میت کے لئے نہ سہی کچھ خرچ کے لئے تو دینے دو اِسے۔''، میں نے گھنگھریالے بالوں والی عورت سے صابرہ کو پیسے دینے کی اجازت مانگی۔

''میرے پاس میرے بچّے کے کام کے لئے پیسہ ہے۔ یہ میرا حق ہے۔ میں تو اس کو اور میرے مَرد کو بہت بولی تھی کہ میں خرچہ کرنے کو تیار ہوں، مجھے لڑکا دے دو۔ پھر میں اسے اسپتال لے چلتی ہوں لیکن اس نے ایک نہیں سنی، جیسے کہ بچّہ بڑا ہو کر میرا ہی سہارا بننے والا تھا۔''، گھنگھرالے بالوں والی عورت جب ایسا کہہ رہی تھی، تب مجھے اُس کے چہرے پر بڑی بیوی ہونے کا ٹھسّہ دکھائی دیا۔

میں نے پرس میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر صابرہ کے ہاتھ میں رکھنا چاہا۔ تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور بولی،

''تم روپے کیوں دے رہی ہو، وہ میرا بھی تو بچّہ تھا۔ وہ میری سوَت ہے تو کیا ہوا، ہے تو وہ میرے مرد کی بیوی ہی۔ میرا مرد اسے چاہتا ہے، کیا یہ کم ہے۔ میرے پاس روپیہ ہے۔''

میں حیرت سے اُسے دیکھتی رہی اور سست چال سے چلتی ہوئی گھر پہنچی۔ دروازے پر کام والی بائی میرا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆

ایس ایم ایس

پچھلے مہینے کرشنا اپنے گھر والوں کے ساتھ ناسک گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنے ددھیال کے ایک رشتہ دار کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی۔ وہاں سے اپنے ننہال دھولیہ گیا۔ گاؤں میں اُن دنوں میلا لگا ہوا تھا۔ موت کے کنویں کا کھیل اُسے بے حد پسند تھا۔ بار بار دیکھا۔ ہر بار باہر آکر ٹکٹ لینا ہوتا۔ ہر بار کوئی دوست کچھ کھانے کو لے آتا۔ اس میلے میں پتہ نہیں کیسی پانی پوری کھالی تھی، قلفی تھی یا پھر سموسوں کا ہی اثر تھا، بیمار پڑا۔ اسپتال سے لوٹا تو ننہال کے دوستوں نے کہا، ''یار ممبئی چلتے ہیں۔ بڑے دنوں سے گھومے نہیں۔''

دوستوں کی بھی یاد آرہی تھی۔ اور گھر بھی خالی تھا۔ آئی بابا سے ضد کر کے دو دوستوں کے ساتھ چلا آیا۔

نئی ممبئی پنویل کے سیکٹر ایک کے پر جاپتی کاسکیڈ نامی عمارت کی لفٹ میں آٹھویں منزل پر پہنچ ہی رہا تھا کہ ایک فون آیا۔ چھوٹی سی گھنٹی بجی تھی۔

'ارے واہ! تجھے تو مسڈ کال بھی آتے ہیں۔'' دوست ہنسنے لگے،

''چل کرلے، کرلے کال۔''

''بیلینس نہیں ہے''۔

''کس کا کال ہے؟'' چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔

پتہ نہیں۔''

کرشنا کھانا بنا رہا تھا۔ پچھلے دنوں انہوں نے گھر میں موڈیولر کچن لگوالیا تھا، اس

طرح سے کچن میں کام کرتے ہوئے اُسے مزا آرہا تھا۔ کسی فلمی گیت کی دھن پر تھرکتے ہوئے اس نے آٹو اِگنیشن چولھے کو بغیر لائیٹر، ماچس کے جھٹ سے آن کیا۔ پتیلی میں گھی ڈال کر دال کو تڑ کا لگا رہا تھا کہ اُسی نمبر سے ایس ایم ایس آیا۔ لکھا تھا۔ ''ہائے!''

''کرشنا نے بھی جواب میں ایس ایم ایس کیا۔ ''کون ہو؟''

''دوست نہیں ہوں، مگر تم اچھے لگتے ہو۔ دوستی کرلو۔'' جواب ملا۔ کرشنا کو عجیب لگا کچن سے باہر آیا۔ واش بیسن میں ہاتھ دھو کر اُس پر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

''شکل سے میں اتنا بُرا بھی نہیں! صاف سانولی رنگت، اونچا لمبا چھے فٹ کو چھوتا قد۔ چہرے مہرے میں کوئی خاص بات نہیں، پیشانی کچھ کچھ دھنسی ہوئی ہے، پھر بھی سمارٹ دکھائی دیتا ہوں۔'' اُن کے پنویل کے دوست بھی گھر آئے ہوئے تھے۔ کرشنا نے اپنے گھنگھرالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک مست سے انداز میں اُن سے کہا، تو وہ بھی دھولیہ کے دوستوں کے ساتھ مل کر اُس کا مذاق اُڑانے لگے۔

''فون کر، فون کر۔'' اُن میں وہ ہیرو بن گیا تھا۔

''سپیکر پر ڈال دینا۔ ہم بھی سنیں گے۔ ذرا مزا کریں گے۔''

کرشنا نے کئی بار فون کیا۔ سامنے والے نے نہیں اُٹھایا۔

کچھ دیر بعد ایس ایم ایس آیا۔ ''گھر پر ہوں۔ فون نہیں اُٹھا سکتی۔ چیٹ سے بات کریں گے۔''

''اوکے۔'' میرے دوستوں نے زور سے چلاّ کر اس پیغام کو پڑھا اور اُسی طرح جواب بھی دیا۔

''میرا نمبر تمہیں کیسے ملا؟'' کرشنا نے اپنے موبائل پر ٹائپ کیا اور اسے بھیج دیا۔ وہ حیران تھا۔

''ایک لڑکے سے ملا۔''، پیغام آیا۔

کرشنا سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ اتنے میں دوبارہ سندیش آ گیا۔

''مجھے پتہ ہے تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے۔ نمبر بھی معلوم ہے۔''

''اچھا!''، کرشنا چونکا۔

''ملنا چاہو گے؟ پانچ بجے سیکٹر چار میں ساگر ہوٹل کے پاس آجانا۔''

دن بھر مختلف علاقوں میں دہی ہنڈی کے پروگرام ہوتے رہے۔ وہاں سے فری ہوئے تو سارے دوست پانی پوری کھانے کے لئے سیکٹر ایک میں رِدّھی سِدّھی اپارٹمنٹ کے نیچے واقع چاٹ بازار پہنچے ہی تھے کہ موبائل پر سندیش آیا۔

''آئے کیوں نہیں۔'' کرشنا نے دیکھا، اُس وقت آٹھ بج رہے تھے۔

''ارے یار دہی ہانڈی دیکھتے دیکھتے بھول ہی گیا۔ ابھی پہنچتا ہوں۔'' کرشنا نے ہڑبڑا کر جواب لکھا۔

''نہیں آؤں گی۔''، جواب میں ایس ایم ایس آیا۔

''ساری''! کرشنا نے بائیں ہاتھ سے اپنا کان پکڑا اور دائیں سے سندیش لکھ کر بھیج دیا۔

''او۔ کے۔''

رات کے کسی پہر موبائل پر سندیش کی آواز آئی۔ لکھا تھا،''پلئے کالج آسکو گے؟''

کرشنا نے وقت دیکھا۔

''اِس وقت رات کے دو بجے ہیں!''، اس نے جواب بھیجا۔

''پتہ ہے.....مگر دیکھنا ہے۔''

''کیا وہاں رہتی ہو؟''، اس نے تجسس سے پوچھا۔

''گیٹ نمبر دو پر آنا۔ پیچھے والے گیٹ پر۔''

''کیا وہاں رہتی ہو؟ وہاں تو رو ہاؤس ہیں۔ تمہارے گھر کا نمبر کیا ہے؟''، کرشنا نے اپنا سوال دہرایا۔

''نہیں۔ سامنے کی بلڈنگ میں ایک رشتہ دار کے گھر آئی ہوں۔''

''تم باہر آسکو گی؟''

''نہیں پاپا پاس ہی سوئے ہیں۔''

''پھر کیا فائدہ''!، وہ اداس ہو گیا۔

''دیکھنا ہے۔''

'عجیب الجھن ہے! اتنی رات گئے... موٹر سائیکل چلانے پر گھر والے اُٹھ جائیں گے۔'، کرشنا بڑبڑایا۔ اور سرہانے سے اپنا موبائل اٹھا کر ٹائپ کرنے لگا،

''اِس وقت میں بھائی کا فون ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میرے فون کی بیٹری ڈاؤن ہے۔ چارج کرنے کے لئے گھر پر چھوڑ رہا ہوں۔ اسی پر فون کرنا، نمبر نوٹ کرلو......'' کرشنا نے آدتیہ کا نمبر ایس ایم ایس کر دیا۔

''تجھے جانا ہے۔'' کرشنا نے اپنے دوست آدتیہ کو فون لگایا۔ آدتیہ پلئے کالج کے مین گیٹ کے سامنے آدرش بلڈنگ میں رہتا تھا۔ اُس کا گھر ممبئی کے مضافات میں دہیسر علاقے میں ہے۔ وہ یہاں پڑھائی کے لئے تین دوستوں کے ساتھ ایک فلیٹ شیئر کرتا ہے۔

''اوکے''۔ آدتیہ، کرشنا کی توقع کے مطابق بغیر کوئی حیلہ کئے فوراً مان گیا۔

''رومال لیتے جانا۔''، کرشنا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ میری ناک نہیں بہہ رہی۔''، آدتیہ کی آواز میں نیند تھی۔

''رومال کا نقاب باندھ کر جانا ہے۔''

آدتیہ، سیکٹر سولہ پلئے کالج کے پچھلے گیٹ پر کھڑا پانچ منٹ سے فون کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسے موبائل پر پیغام آیا۔ ''رات بہت ہو گئی ہے۔ دیکھ لیا......اب گھر جاؤ۔'' آدتیہ پریشان ہوا۔ اُس نے کرشنا کو فوراً فون لگایا۔ بولا، ''یار! یہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''پکا پتہ ہے۔ لڑکی کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے کیا؟''

''تجھے پورا یقین ہے؟''

''ہاں...پکا''، آدتیہ کی آواز میں خود اعتمادی تھی۔

''اچھا! پھر دوست کیا کرنا ہے؟''

''چل پولس سٹیشن میں شکایت درج کرائیں گے۔''

''صبح چلتے ہیں۔''، کرشنا نے بھی جیسے ٹھان کر کہا۔

صبح دس بجے آدتیہ، کرشنا کے گھر آیا۔

''نہیں، کسی کو تکلیف نہیں دیں گے۔'' کرشنا نے پولس سٹیشن جانے سے انکار کردیا۔ آدتیہ کی بات پر اُسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ یہ لڑکی ہی ہے...

اگلے دن آدتیہ اور کرشنا نے اپنے ناسک کے دوست کو فون کر کے ساری بات بتائی اور کہا۔ ''تو اس کو اپنے یہاں کے کوائن باکس سے فون کر۔'' اس نے ایسا ہی کیا مگر فون نہیں اٹھایا گیا۔ آسام، اورنگ آباد، ممبئی، پنویل سبھی جگہ کے دوستوں سے فون کروایا۔ نہ کسی نے فون اُٹھایا اور نہ ہی سندیش بھیجا۔

شام کو چھ بجے کرشنا کو اس کے موبائل پر سندیش ملا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''مجھے چَیٹِنگ پسند نہیں۔'' کرشنا نے بیزاری سے جواب لکھا اور بھیج دیا۔

تبھی فون بجا۔ کرشنا کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا کیوں کہ فون اسی نمبر سے آ رہا تھا جس سے اسے ایس ایم ایس آتے تھے۔

''تم ہی ہو؟'' کرشنا نے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' کھنک دار آواز میں وہ بولی۔

''میں تمہیں کس نام سے بلاؤں؟'' کرشنا نے پوچھا۔

''جس نام سے چاہو؟'' لڑکی کی آواز میں نخرے کا انداز تھا۔

''اپنا نام بتاؤ۔''، کرشنا نے پوچھا۔

''پریا۔''، اُس کا جواب آیا۔

''کس کالج میں ہو؟''، کرشنا کا تجسس بڑھا۔

''پہلے سینٹ جوزفس میں پڑھتی تھی۔ پھر 'پلئے پالیٹیکنک' سے کمپیوٹر انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا۔''

''ملنے آؤ گی؟''، کرشنا نے خواہش جتائی۔

''کہاں؟''

''تم بتاؤ!''

''اس بار تم ہی آؤ گے نا؟'' آواز نے شرارت سے پوچھا۔

''کیا!!!''

''کیفے ون فورتھ، آجاؤ۔''، آواز نے شوخی سے ہنس کر کہا۔ کرشنا کے کانوں میں گھنگرو بجے۔

''ہم بھی چلیں گے۔''، کرشنا نے اپنی نئی کالی جینس اور ہلکی گلابی ٹی شرٹ نکالی۔ وہ نہا کر کپڑوں پر خوشبو سپرے کرنے لگا۔ تو دوستوں نے ادھم مچایا۔

اس رات ساڑھے آٹھ بجے تک وہ سب انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آئی۔ وہ لوٹنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ موبائل کا سندیش ٹیون آیا۔

''واٹ اِز رانگ وِتھ یو؟ اکیلے بلایا تھا نا!!...... تمہیں دیکھا اور چلی آئی۔''

موبائل کا پیغام پڑھ کر کرشنا کو غصہ آ گیا۔ اسی وقت اس نے اسے فون لگایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ فون بند کر کے کرشنا نے سندیش ٹائپ کیا۔

''اور میں بے وقوف کی طرح دو گھنٹوں سے تمہارا انتظار کرتا کھڑا رہا۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟''، کرشنا کے موبائل سے سندیش دوسری جانب چلا گیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' وہاں سے بھی کرارا جواب آیا۔

''تم کیا کوئی آسمان کی پری ہو؟... کہ کسی نظر پڑتے ہی اُڑ جاؤ گی؟''، کرشنا نے غصہ میں بھی اچھے الفاظ استعمال کیے۔ مگر شاید سامنے والی نے اس کا مزا نہیں لیا۔ جوابی ایس ایم ایس آیا،

''تم کیا کوئی ہیرو ہو کہ چمچوں کے بغیر تمہارا کام نہیں چلتا؟''

''تمہارے بوائے فرینڈ کتنے ہیں؟''، کرشنا کا پارہ چڑھنے لگا۔

''شک کرتے ہو؟''، ایس ایم ایس میں ناراضگی اور حیرانی تھی۔

''تو میرے پیچھے کیوں پڑی ہو؟''، کرشنا نے بھی سندیش بھیجا، ''فون کر رہا ہوں، اٹھاؤ۔ بات کرنا چاہتا ہوں۔''، کرشنا نے سامنے والی کے دل میں آگ بھڑکانے کا حربہ آزمایا تھا۔

''نہیں میں پریوار والوں کے ساتھ بیٹھی ہوں۔''، جواب میں مجبوری محسوس ہوئی مگر اس سندیش کے باوجود کرشنا نے فون لگایا...شاید تیر نشانے پر لگا ہو! لیکن جواب ریکارڈ کیے ہوئے پیغام نے دیا۔ ''آپ جس نمبر پر رابطہ کر رہے ہیں، وہ ابھی بند ہے۔''

کئی دنوں تک کرشنا کبھی فون کرتا رہا، کبھی ایس ایم ایس۔ سامنے سے فون بند ہونے کا سندیش آتا رہا۔ تیرہویں دن کرشنا کو فون کا سندیش ملا۔ لکھا تھا،

''کیا ہے؟؟''

''پچیس چھبیس سندیش بھیجے، فون کیے۔ جواب کیوں نہیں دیا؟ فون آن کیوں نہیں کیا؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی کیا؟ اگر ہوئی ہے تو یہ آخری بار کی غلطی ہے...... ہے تو بتاؤ تاکہ میں آگے نہ کروں۔'' کرشنا نے لمبا چوڑا سندیش کیا۔

''غلطی تم سے نہیں مجھ سے ہوئی ہے۔''

''...... کہ پیار کیا؟'' کرشنا نے جوابی سندیش بھیجنے میں دیر نہیں کی۔ مگر جواب کچھ ایسا ملا۔

''ڈاکٹر موہتے کے اسپتال کے سامنے کھڑی ہوں۔ وہاں سات منٹ میں پہنچو۔''

''کرشنا نے اپنے لباس پر نظر ڈالی، چیکس والی اِس جامنی ٹی شرٹ اور نیوی بلو جینس پینٹ میں اُس سے ملنے میں کوئی ہرج نہیں!'، اُس نے سوچا اور لفٹ سے باہر نکلتے ہی وقت ضائع کیے بغیر اپنی موٹر سائیکل ریمپ سے اتاری اور بائیں جانب مڑ کر موہتے اسپتال کی طرف گاڑی دوڑائی کہ بھائی کا فون آیا۔ ''کہاں ہو؟''

''جہاں بھی ہو فوراً گھر پہنچو۔ مجھے سٹیشن ڈراپ کرو۔ آج آٹو رکشہ کی ہڑتال ہے۔ میری ٹرین چھوٹ جائے گی۔''

کرشنا نے سرکل سے گھما کر موٹر سائیکل کا رخ اپنے گھر کی جانب کر دیا۔ اس نے فوراً آدتیہ کو فون کیا۔ ''تو اس ایس ایم ایس والی کو دیکھ آ کہ کیسی ہے۔ میں ابھی نہیں جا سکتا۔''

''کیسے پہچانوں گا؟''، آدتیہ نے اس سے پوچھا۔

''موہتے اسپتال کے سامنے کھڑی ہے۔ اکیلی ہے۔ اس وقت میں نہیں جا سکتا۔ وہ نکل جائے گی۔''

''کیا بولوں؟''، آدتیہ کو کرشنا کی یہ بات عجیب سی لگی۔

''وہ تجھ سے بات نہیں کرے گی۔ بس اُسے دیکھ آنا۔''

''دیکھ کر کیا کروں؟''، آدتیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''کم سے کم اسے پہچاننے میں میری مدد تو کر سکے گا!''، ''اگلی بار کے لئے ...شناخت کے لئے...''، کرشنا آدتیہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ذرا سا سٹپٹایا۔

''شاید اس نے تجھے دیکھا ہے۔ پہچانتی ہے!''

بھائی کو سٹیشن پر چھوڑ کر کرشنا موہتے اسپتال پہنچا۔ آدتیہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''چلی گئی؟''، اسے دیکھتے ہی کچھ پوچھنے سے پہلے ہی آدتیہ بولا۔

''دیکھنے میں کیسی ہے؟''

''ینگ ہے نا!''، آدتیہ کی بات سننے سے پہلے ہی دو سوال ایک ساتھ کرشنا کے منہ سے نکل گئے۔ اسی وقت کرشنا کا فون بجا۔ اٹھانے پر فون بے آواز تھا وہ پانچ منٹ تک ہیلو ہیلو کرتا رہا۔ مگر کوئی آواز سنائی دی تو تھی، خاموشی کی۔ پھر فون بند ہو گیا۔ اور سوِچ آف کی صدا نے اسے بے چین کر دیا۔

کرشنا تڑپ رہا تھا۔

چوبیس ستمبر کی رات وہ بہت بے چین تھا۔ پچیس کو اس کی سالگرہ تھی۔ بارہ بجنے سے دو منٹ پہلے سندیش آیا، ''سالگرہ مبارک!''

''شکریہ۔ کب ملو گی؟'' کرشنا نے جواب لکھا۔

''کبھی نہیں۔ اب تم مجھے کبھی دیکھ نہیں پاؤ گے۔''

''میں ڈھونڈھ کر دکھاؤں گا۔''

''ڈانڈیا کھیلتی ہو؟''

''ہاں''

''کس علاقے میں؟ کرشنا نے پوچھا۔

''میں نہیں بتاؤں گی۔''، جواب دیکھ کر کرشنا خلا میں گھورنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' آدتیہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''اس کا فون بند ہو گیا یار!'' کرشنا نے بے بسی سے آدتیہ کو دیکھا

آدتیہ چڑ گیا،''اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں دیوانہ بنا رہا ہے؟ کیا تجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے تجھ سے شادی نہیں کرنی ہے۔''

''مجھے بھی نہیں کرنی!''

''پھر کیا ہے؟''، آدتیہ حیران تھا۔

''اُس نے کہانی شروع کی ہے...... میں اس کا انت کروں گا۔''

''تجھے چاہئے کیا؟؟''، آدتیہ چڑ گیا۔

''صرف ملنا ہے۔''، کرشنا کی آواز ضدّی تھی۔

''کیوں؟'' آدتیہ ذرا نرم پڑا۔

''صرف پوچھنا ہے کہ تو مجھے پریشان کیوں کر رہی ہے؟''،آدتیہ کو کرشنا مجبور سا لگا۔

''اچھا ہوا کہ ابھی ملی ہے۔ کچھ مہینے پہلے ملی ہوتی تو بی کام فیل کہلاتا۔''

''مجھے چیٹنگ پسند نہیں۔ فون پر بات کرنا پسند نہیں۔ اس کا ائیرٹیل کا نمبر ہے، میرا ریلائنس کا۔ ہمیں ایس ایم ایس کرنے کے بھی پیسے لگتے ہیں۔ فری فون تو نہیں۔ پھر کیوں؟....'' سوال کرتے ہوئے کرشنا اپنے دل کی گہرائی میں اترا ہوا تھا۔

''ارے یار تو اتنا سیریس کیوں ہو رہا ہے؟'' آدتیہ نے اسے جھنجھوڑا، ''ارے یار تو سمجھتا کیوں نہیں! کچھ لڑکے خود کو لڑکی ظاہر کر کے ایسے کھیل کھیلتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر کسی لڑکی سے بات بھی کروا دیتے ہیں۔''

''یہ وہ نہیں ہو سکتی، ملوں گا...... آواز سنوں گا...... شاید تبھی سمجھ آئے...... تیرے ائیرٹیل والے دوست نے پتہ کیا کیا کہ اس کا فون کس کے نام پر ہے؟'' کرشنا کے چہرے سے دیوانگی جھلک رہی تھی۔

''ہاں،.... میں تجھے بتانا ہی بھول گیا، اس کا فون ایک لڑکے سبھاش کے نام پر ہے، اور اس کا پاس ورڈ ہے راجستھان جے پور''۔ آدتیہ نے سوچا، وہ کرشنا کی دیوانگی کو کچھ کم کر پائے گا۔

''چھوڑ یار! اس سب کا کیا فائدہ؟'' آدتیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا، ''پلیز! بھول جا یہ سب۔''

''مجھے کنفیوز کیا ہے...... میری سیدھی سادی زندگی میں آئی۔''

''تم دونوں تو ٹائم پاس کر رہے ہو نا؟''، آدتیہ نے یاد دلایا۔

''اگر ایسا ہے...... تو میں اسے اپنے کو یوز اینڈ تھرو کرنے نہیں دوں گا۔ کیا میں استعمال کر کے پھینکنے کی چیز ہوں؟...... مجھے تو ملنا ہے...... ملنا ہے، مطلب ملنا ہے۔ اور مجھے اس سے ملنے میں تمہاری مدد چاہئے، کرو گے نا!''، ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور جبڑے تنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆

ابارشن

''تمہارے پتی تو بہت سے ٹیچروں سے بہتر ہیں۔''، پروفیسر کی تعریف سن کر ترچھی مانگ میں ہلکا سا سندور لگائے ہوئے گورے چہرے پر بڑی کٹورے جیسی آنکھوں سے وہ مسکرادی''۔''کم سے کم بیوی کے معاملے میں تو! دیکھا کتنی قسمت والی ہو تم!......کون پڑھاتا ہے اپنی بیوی کو؟'' وہ پھر سے مسکرائی۔

پروفیسر آگے بڑھ گئیں۔ کچھ منٹ بعد پروفیسر نے پلٹ کر دیکھا، وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ کامرس فیکلٹی کی تھی اس لئے پروفیسر کی اس سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کامرس ان کے کالج میں دوپہر میں ہوتا تھا۔ پروفیسر نے ہال ٹکٹ جانچنے کے بہانے سے اس کا نام جان لیا۔'سرینا'

وہ سالانہ امتحان کا پہلا پرچہ تھا۔ پروفیسر کا سُپر وزن بلاک دس میں لگا تھا۔ اس بلاک میں پہنچ کر ہر بار وہ پہلا کام یہی کرتی ہیں کہ کمرے کی آخری دو کھڑکیاں کھول دیتی ہیں۔ تختہء سیاہ کے قریب والی کھڑکی کے بالکل سامنے کچھ فاصلے پر ایک آم کا درخت تھا، جس کی شاخیں کالج کی عمارت کو چھو رہی تھیں۔ گہرے ہرے رنگ کے کچھ آم پتوں کے درمیان سے جھانک رہے تھے کہ اتنے میں کوئل کوکی۔ اس کی میٹھی آواز پروفیسر کو مدہوش کرنے لگی۔ یہ کھڑکیاں عام طور پر بند رہتی ہیں کیوں کہ کھڑکی سے بالکل نیچے کالج کی عمارت سے پانچ فٹ کی دوری پر کھڑی چھوٹی سی دیوار کو لگے ہوئے کرناٹکی مزدوروں اور مقادموں کے گھر ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے وہاں کھڑا آدمی کالج کے باہر ہی نہ ہو۔ کیوں

کہ پہاڑی پر مقیم اس کالج سے ذرا ڈھلان پر ہیں یہ گھر۔ایک لیول کی زمین کے اس ٹکڑے کے بعد الگ الگ سطحوں پر پہاڑی اونچی ہوتی جاتی ہے۔اس علاقے کا نام ہے'بٹ ون'۔ یہاں نہ بٹ یعنی برگد کے درخت ہی ہیں اور نہ کوئی ون جنگل۔کالج سے دیکھا جائے تو نگاہ پہاڑی کی اونچائی تک جاتی ہے۔لیکن اس کے بعد پہاڑی کی مختلف سطحیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر کو'بٹ ون' کے منظر سے نظریں ہٹانی پڑیں۔'قے کرنے کی ہلکی سی آواز کلاس میں گونج اُٹھی تھی۔کھڑکی کی جانب بیٹھی اُسی لڑکی نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گردن ہلا کر باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔وہ منہ پر ہاتھ رکھے رکھے قے ضبط کرتی ہوئی، واش روم کی طرف جانے لگی۔

میزنائن منزل پر اس کا شوہر پینے کے پانی کے کولر کے پاس کھڑا تھا۔لپک کر آیا اور اسے سنبھال کر باتھ روم کے واش بیسن کی طرف لے گیا۔یہ منظر بڑا عجیب تھا۔پروفیسر کی اپنی نند اُن کے ہر سال ایڈمشن لینے پر چڑھتی۔یہ ان کی شادی شدہ زندگی کے ابتدائی سال تھے۔

''اور کتنا پڑھنا ہے بھابھی؟......اور کچھ کام نہیں ہے کیا......؟''

''اچھا بہانہ ہے کام نہ کرنے کا۔''شوہر انجان رہتے۔انہیں بیوی کے پڑھنے نہ پڑھنے سے کچھ سروکار نہیں تھا۔

پروفیسر کلاس کی آخری خالی بینچ پر بیٹھی سپر وائزر رپورٹ پر حاضر طلباء کے نمبر لکھ رہی تھیں۔لڑکے لڑکیاں اپنے جوابی پرچوں پر جھکے ہوئے تھے۔کونے میں بیٹھا لڑکا ذرا گردن اونچی کر کے سامنے والے کے پرچے پر نظر گاڑے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔پروفیسر نے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کلاس میں راؤنڈ لگایا۔زیرِ لب مسکراتے ہوئے وہ اسی خالی بینچ پر جا بیٹھیں۔تبھی سرینا لوٹ آئی۔وہ قے کرنے سے نڈھال تھی اور کھڑکی کے قریب والی اپنی بینچ پر بیٹھ کر رونے لگی تھی۔اس کا

شوہر برآمدے میں اس کے پاس کھڑکی میں کھڑا شاید اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔لڑکی نے بینچ پر سر ڈال دیا اور ایسے سر ہلانے لگی جیسے کہہ رہی ہو، 'نہیں نہیں، مجھ سے نہیں ہوگا'

اس کا شوہر اسے پچکار کر کبھی اس کا ہاتھ سہلانے لگتا تو کبھی اس کے بالوں میں انگلیاں دھنسا کر اندر ہی اندر اس کا سر سہلاتا۔ابھی امتحان شروع ہوئے بیس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔دو تین لڑکے خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔پروفیسر کو کلاس میں اس طرح کی حرکت سے بڑی الجھن ہوئی۔انہوں نے دور سے سرینا کے شوہر کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔مگر اس نے اُن پر سے نظریں ہٹالیں، جیسے انہیں دیکھا ہی نہ ہو۔سرینا نے سر اُٹھا کر پروفیسر کی جانب دیکھا۔جیسے اجازت طلب کر رہی ہو۔اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا رکھا تھا۔انہوں نے جلدی سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔وہ کلاس سے باہر جا کر برآمدے میں دروازے کے باہر کھڑی منہ پر ہاتھ رکھے بے آواز رونے لگی۔ چند منٹوں بعد پروفیسر نے کلاس میں راؤنڈ لگانے کے بہانے باہر جھانک کر دیکھا۔سرینا سیڑھیوں پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دئیے شاید رو رہی تھی۔اس کا جسم کانپ رہا تھا اور چہرا اس کی دونوں بانہوں میں چھپا ہوا تھا۔سیڑھیوں پر پاس بیٹھا اس کا شوہر اسے سمجھا رہا تھا۔

"دے دو امتحان!...... ہو جائے گا...... مجھے پتہ ہے تم کرلوگی...... کیوں گھبراتی ہو؟...... میں ہوں نا!......"

"نہیں...... مجھے چکر آتے ہیں...... بار بار اُلٹی آتی ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا...... تھوڑا سا لکھ لو۔پچاس میں سے اٹھارہ بھی مل جائیں تو چلے گا...... فائنل اِگزام میں کور ہو جائے گا...... تھوڑا سا لکھ لو۔"

"نئیں...... نئیں......" سرینا کی آواز کلاس کی پِن ڈراپ خاموشی کو توڑنے لگی۔ پروفیسر بینچوں کی قطاروں میں اپنا اگلا راؤنڈ پورا رہی تھیں۔وہ باہر آئیں۔دیکھا میزنائن منزلے پر سرینا کا شوہر اس کا ہاتھ بڑے رومانی انداز میں پکڑے اس کے گالوں پر جھک رہا تھا۔اور سرینا انکار میں گردن ہلا رہی تھی۔پروفیسر بہت ناراض ہوئی، بولیں، "چلو چھوڑ اس کو!...... ہاتھ لگا کر کیا بات کرتے ہو......؟"

''میں اس کا پتی ہوں!'' وہ برا مان گیا۔

''پتی ہو تو کیا؟...... یہ کالج ہے یہ سب گھر جا کر کرو۔''

''میڈم! میں صرف اس کو امتحان دینے کو سمجھا تا ہوں۔'' وہ نرم پڑا پھر ذرا تھم کر بولا، ''وہ ڈرتی ہے...... کچھ نہیں ہوتا ہے...... اُس کو بس...... بس اُلٹی چکر......''

''خوش خبری ہے؟''

''ہاں...... وہی تو...... ابھی دو مہینے ہی ہوئے ہیں شادی کو۔''

''اگلی بار دے دے گی امتحان''، پروفیسر مسکرا کر بولیں۔

''سال بیکار جائیگا نا!''

''جانے دو نا!''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس کو پہلے ہی سے شوق تھا پڑھائی کا...... مگر ابھی نا بولتی ہے پڑھنے کو۔''

''اگلے برس پڑھ لے گی نا!''۔ پروفیسر بولیں۔

''یہ امتحان میں پاس ہو جائے گی تو میرا سیٹھ اس کو نوکری پر رکھ لے گا نا! ہمارے یہاں اِس وقت ویکینسی ہے۔''

''نہیں!''، سرینا گھٹنوں میں سر دیئے ہرگز نہیں کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

پروفیسر کو نفرت سی محسوس ہونے لگی۔

'طبیعت ٹھیک نہیں، تب بھی امتحان دے تا کہ جلدی نوکری کر لے...... ایسی بے رحمی...... صرف پیسے کمانے کے لئے!!.... کتنا لاڈ کر رہا ہے !.... امتحان دِلائے بغیر چھوڑے گا تھوڑے ہی!'، وہ سوچ ہی رہی تھی کہ تبھی ایک لڑکا کلاس سے باہر آیا اور بولا،

''سپلیمینٹ...... میڈم!''

سپلیمینٹ دے کر اور کلاس کے دروازے سے باہر آ کر کھڑکی میں پڑی دھاگے کی ڈوری اٹھا کر دیتے ہوئے انہوں نے یوں ہی سیڑھیوں پر دیکھا۔ دونوں وہاں نہیں تھے۔ انہیں تشویش ہوئی۔ لڑکی پیپر لکھے بغیر کہاں چلی گئی!...وہ برآمدے میں نکل

آ ئیں۔اوپر آسمان پر کچھ اودے کچھ سفید بادل مختلف صورتیں بنا رہے تھے۔ایک جیٹ اپنے پیچھے دھوئیں کی ایک لمبی لکیر چھوڑ کر کب کا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔انھوں نے دیوار سے نیچے جھانکا۔دیکھا، سیڑھی سے نیچے سرینا کا شوہر اُسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لئے جا رہا تھا، ''چل اسپتال، آج ہی تیرا ابارشن کرواتا ہوں......''، وہ غصے کی شدّت کو قابو میں کرنے کی کوشش میں ہانپ رہا تھا۔

باڈی

''باڈی کولکاتا بھیجنی ہے، کیا خرچ آئیگا؟''، ملک سیٹھ سیدھے ممبئی کے مشہور ماہم چرچ کے قریب 'مائیکل پٹو انڈر ٹیکر' کے دفتر پہنچے اور کلرک سے پوچھا۔

''ساڑھے تیرہ ہزار سر۔ آٹھ ہزار کارگو کا، پانچ ہزار پیکنگ کا، کیمیکل لگانا... اسپتال سے سرٹیفیکیٹ لینا کہ ٹھیک سے پیکنگ ہوا ہے... یعنی سب کچھ۔''، چوڑے چہرے اور بائیں کان میں چھوٹی سی چاندی کی بالی پہنے ناٹے شخص نے جس کا نام مائیکل تھا، ذرا رک کر جواب دیا۔

''سب کچھ یعنی؟''، ملک سیٹھ نے اور وضاحت چاہی۔

''یعنی.. آپ مجھے این او سی اور کاز آف ڈیتھ سرٹیفکیٹ لاکر دے دیجئے... باڈی دے دیجئے، باقی سب ہم کرلیں گے۔ بس آپ کو یہی کرنا ہے کہ باڈی وہاں کولکاتا میں ریسیو کرنی ہے۔''

''جیسے ہی یہ سب ریڈی ہوگا، ہم آپ کو فون کر دیں گے، آپ سائن اسپتال آجانا۔''، ملک سیٹھ نے اس کی بات سے مطمئن ہوکر کہا۔

''ایڈوانس دیتے ہو کیا؟''کلرک نے پوچھا۔

''..دیتے ہیں نا!.. پہلے پروسیجر تو ہوجانے دو... ابھی ایڈوانس کی کیا ضرورت ہے؟'' ملک سیٹھ اس کی جلد بازی سے ذرا سا ناخوش ہوکر بولے اور کرسی سے اٹھ کر لائیٹر سے سگریٹ جلائی اور ہونٹوں میں دبالی۔ پھر دھیمی چال چلتے ہوئے اپنی اِنووا کار کی طرف بڑھ گئے۔

'مائیکل پنٹو انڈر نیکر' کے پاس سے ملک سیٹھ سیدھے سائن اسپتال پہنچے۔ کستور با اسپتال سرکاری ہے، جو سائن اسپتال کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اسپتال کے گیٹ ہی میں پولس چوکی ہے۔ منڈل اور اس کا بھائی وہیں کھڑے تھے۔ انکے چھوٹے بھائی کی لاش مردہ خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ سیٹھ کو لہراتی زلفوں کے ساتھ کار سے اترتے ہوئے دیکھ کر دونوں انکی طرف لپکے۔

منڈل، ملک سیٹھ کے کنسٹرکشن سائٹ میں سے ایک، مہاراشٹر کے نئے صنعتی علاقے رانجن گاؤں میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو سیٹھ کے پاس کام پر لگانا چاہتا تھا۔

''اِس کا نام کیا ہے؟''، اپنے ائیر کنڈیشنڈ ہلکے نیلے آفس کے ریوالونگ چیر سے کمپیوٹر سے گردن اُٹھا کر سیٹھ نے منڈل سے سوال کیا۔

''روحیم۔''

''روحیم؟....رحیم نام ہوگا؟''

''ہاں صاب!''

''مسلمان ہو؟''

''ہاں صاب!''

''کیوں بھئی منڈل! تم شومن منڈل اور یہ رحیم؟ یہ کیسے؟''

''میرا نام شولیمان منڈل ہے صاب۔ اسکول میں ٹیچر نے شومن لکھ دیا۔''

''شومن منڈل، تم سُلیمان منڈل؟؟ اوہ!''، سیٹھ اپنی حیرانی کو درگزر کرتے ہوئے بولے،۔''ہاں... منڈل تمہارا نام نہیں سرنام ہے۔ مگر میں تمہیں اسی نام سے بُلاتا رہا۔ اب گاؤں سے اپنے بھائی کو کام پر لائے ہو، تبھی تمہارے نام پر دھیان گیا ہے، ورنہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ تم مسلمان ہو! شاید کسی اور کو اِس کا پتہ بھی نہیں ہو!''

''جی صاب!''، منڈل نے سر جھکایا۔

''اچھا خیر! میں رحیم کو اپنے دوسرے سائٹ، 'پریسیشن میٹل' میں ہیلپر کے طور پر لگا دیتا ہوں۔ یہ سائٹ اٹکر گاؤں میں واقع ہے۔ پتہ ہے نا؟''سیٹھ کام کی بات پر آ گئے۔

''یہیں اپنے رائیگڑھ ضلع میں نا صاحب؟''

''ہاں ہاں! ارے یار!...یہیں، خالہ پور سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر!''

جی صاب۔''

ملک نے رحیم کو ایک اچٹتی نظر سے دیکھا۔ وہ گورا، اونچا تگڑا، تیس سال کا خوبصورت جوان تھا۔ جبکہ اسکا بھائی ٹھگنا اور کچھ گہرا سانولا سا تھا۔ دونوں بغیر مونچھ، داڑھی والے تھے۔ وہ چہرے مہرے اور خاص طور پر اونچی پیشانی سے بھائی نظر آتے تھے۔ رحیم کی طرح اسنے بھی اپنی پتلون کا پائنچہ ذرا سا موڑ رکھا تھا۔ اسکی شرٹ کچھ لمبا تھی، جس کا ایک سرا اس کی پتلون کی کمر میں پھنسا ہوا تھا۔

''جوڑی سے کام کروگے؟ تمہاری بیوی بھی کام کرے گی؟''، ملک نے رحیم سے پوچھا۔

''نہیں صاب! میرے سات اور آٹھ سال کے دو بچّے ہیں۔ بی بی گربھ بتی ہے۔ گھور میں رہتی ہے۔''، وہ بولا۔

''گھور؟''

''ہمارا گھور پرسون نگر میں ہے، تعلقہ جولنگی، ضلعہ مرشد آباد۔''

''اچھا، تو تمہارا گھور پرن نگر میں ہے۔''

''اور مرشد آباد؟''، ملک ابھی چھیڑ کر مزے لینے کے موڈ میں تھا۔

''کولکاتا سے ساڑھے تین گھنٹے کا بس کا سفر ہے۔ ہم لوگ اسّی روپئے بھاڑا دیتا ہے صاب۔''

''گھور چھوڑ کر تمہیں بھی یہاں کیوں آنا پڑا؟ اور آئے ہی تھے تو بیوی کو لے آتے۔ اسے گھور چھوڑ کر کیوں آئے۔''،

ملک کو اپنے سوال کرنے کی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ بیچارے 'روحیم' کو لفظ 'گھور' کو سمجھانے کے لئے اسے اتنی تفصیلات بتانی پڑیں۔

اسنے بنگالی لہجے میں اسکے گھر کو 'گھور' بولنے کا مزہ لیتے ہوئے اسے چھیڑا تھا، تا کہ وہ ایک آدھ بار اسے پھر بولے۔ رحیم کے منہ سے اس کا بولنا بھلا بھی تو معلوم ہو رہا تھا۔

''گھور میں کل اگیارہ لوگ رہتا ہے سیٹھ۔ ماں پتا بھی ہیں، پتا جی کی گاؤں میں پانچ بیگھا زمین ہے۔ جوٹ پیرتا ہے۔ جولائی اگست میں کاٹتا ہے... پھر چاول یا گیہوں پیرتا ہے۔ میرا عورت گھور چھوڑ کر اِدھر آنہیں سکے گا۔''، رحیم نے گھبرا گھبرا کر سب کچھ کہہ دیا۔

اُس دن رحیم کو بخار تھا مگر اس کا سُبھاؤ ایسا تھا کہ وہ گھر پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سائٹ پر پہنچ کر اسنے ساتھیوں کو انہماک سے پسینہ بہاتے دیکھا تو ہنس کر بولا،

''کیا چل رہا ہے۔ چار چار لوگ ایک پتھر کے پیچھے پڑے ہیں۔'' پچھلے سال بھر میں رحیم اپنے منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو دشمن تو بنا ہی چکا تھا۔ ساتھیوں کو لگتا کہ اپنے سخت محنتی اور صحتمند ہونے کا اسے گھمنڈ تھا۔

''اب یہ آ گیا ہے تو اکیلا ہی اٹھا لے گا۔''، مذاق اُڑانے کا موقعہ ملتے ہی ساتھی مزدور اس کا فائدہ ضرور اٹھاتے۔

''خود کو جو سمجھتا ہے سمجھ لے، ہم کو کیوں کام چور جتا تا ہے!'' چاروں آدمی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے کہہ رہے تھے۔ پھر وہ پتھر چھوڑ کر پرے ہٹ گئے۔

''کیوں تم چاروں میں دم نہیں ہے کیا؟''، رحیم بھی پھبتی کسنا نہیں بھولا۔

''تیرے میں تو ہے نا؟... اٹھا لے یار... اٹھا لے...''، رحیم نے پوری طاقت لگا کر پتھر کو اٹھا کر پرے پھینک دیا اور بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ چند منٹوں میں ہی اسے خون کی قے ہوئی۔

''ایسا کیوں ہوا؟''، رحیم کے چاروں ساتھیوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ ''اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ایسا کرتب دکھا چکا ہے نا؟''، ایک ساتھی نے شرمندہ ہوتے ہوئے دوسرے ساتھیوں سے پوچھا۔ سائٹ پر ہنگامہ ہو گیا۔ وہی چاروں ساتھی کمپنی کی گاڑی میں اسے قریبی شہر کھپولی لے گئے۔ رحیم کے بھائیوں کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ اسے مہاویر گارڈن کے قریب کے ڈاکٹر واگھ کے اسپتال لے گئے، جہاں مزدوروں کا بل کمپنی بھرتی ہے۔

''دوبارا اور ایسی خون کی الٹی ہوئی تو بچے گا نہیں۔''، ڈاکٹر واگھ نے کہا۔ ''نئی ممبئی کلمبولی کے سرکاری اسپتال لے جاؤ۔''

دو ہزار روپے خرچ آیا۔ رات میں روحیم نوسکھئے ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہا۔
اگلی صبح بڑا ڈاکٹر آیا۔ بولا،

''ہمارے پاس اس بیماری کا علاج نہیں ہے۔ اس کی اینڈوسکوپی کرنی ہوگی۔ یہاں مشینیں نہیں ہیں۔ سائن اسپتال لے جانا ہوگا۔ سمجھے؟''

''ٹھیک صاب!''، منڈل پریشان ہو کر سر ہلا رہا تھا۔

''یہ دو انجکشن نیچے کے میڈیکل سٹور سے لے آؤ۔ الٹی کنٹرول میں آجائے گا۔ پھر تم اس کو لے کر نکل جانا۔''

میڈیکل سٹور والے سے انجکشن کی قیمت سن کر منڈل چکرا گیا۔ ایک انجکشن کی قیمت ایک ہزار تین سو تھی۔

''میرے پاس دو ہزار روپے ہیں ڈاکٹر صاب!۔''، وہیں سے اُسنے ڈاکٹر کو فون لگایا۔

ٹھیک ہے ایک انجکشن ہی لے آؤ۔''، ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

رحیم کی قے کے سلسلے بند ہوئے لیکن کچھ دیر بعد ایمبولینس میں ممبئی لے جاتے ہوئے پھر شروع ہو گئے۔

سیٹھ سے پیسے منگوا کر منڈل بھائی کو ایمبولینس میں سائن اسپتال لے گیا تھا۔
وہاں وارڈ بوائے سے، منڈل نے، آر. ایم. او. ڈاکٹر سے رحیم کو پہلے دیکھنے کی درخواست کرنے کو کہا، تو اسنے بُری طرح جھڑکا۔

''ایمر جینسی ہے صاب۔''، منڈل گڑگڑایا۔

''ڈاکٹر ایمرجینسی کیس نہیں لیتا۔ لائن سے لیتا ہے۔''

کافی دیر بعد اُن کی باری آئی۔

''اس کا ایکس رے نکالو۔''، ڈاکٹر نے رحیم کو جانچے بغیر ہی کیس پیپر دیکھ کر منڈل سے کہا۔

''رحیم کو دس بارہ سال میں ایک بار تیز بخار آتا ہے۔ ہمارے گھر میں کسی کو ٹی بی نہیں ہے۔''، منڈل نے اپنی سمجھ سے ڈاکٹر کو اطلاع دے کر علاج میں اسکی مدد کی۔ مگر وہ

کوئی پرائیویٹ ڈاکٹر تھوڑے ہی تھا کہ اس کی بات پر دھیان دیتا!

''کاؤنٹر پر پیسہ جما کرادو۔'' اس نے کہا اور گھنٹی بجادی۔

وارڈ بوائے کی رہنمائی سے منجھلے بھائی شفیقل کو بینچ پر روحیم کے ساتھ بٹھا کر منڈل نے کاؤنٹر پر دوسو روپئے جما کرائے اور رحیم کو لینے آیا تو اُسے وہاں نہیں پایا، تو منڈل نے پریشان ہوکر بھائی سے پوچھا۔

''روحیم کو کہاں لے گئے شفیقل؟''

''وہ بیہوش ہو چکا تھا اور اسے فوراً کیزوالٹی روم میں لے جا کر آکسیجن ماسک لگایا ہے۔''، شفیقل بولا۔

آدھا گھنٹہ مشکل سے گذرا ہوگا کہ وارڈ بوائے نے دونوں کو کیزوالٹی میں بلایا۔

''اِسکی عورت کو بُلانے کا، پولس اسٹیشن جانے کا، نوند(؟؟؟؟؟درج) کرانے کا اور پیپر کراکے باڈی لے جانے کا۔''، رحیم کے چہرے سے آکسیجن ماسک نکالتے ہوئے وارڈ بوائے بولا۔ اُس کی بات سن کر دونون بھائیوں کی خشک آنکھیں پھیل گئیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''کیا وہ مرگیا؟''، منڈل نے چیخنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔''، وارڈ بوائے بولا۔

''وہ اسپتال میں پہنچنے کے گھنٹے بھر میں مرگیا؟؟''، شفیقل نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

دونوں بھائی پولس اسٹیشن کی جانب بڑھے۔

''روحیم کو لے کر کیسے جائیگا؟ اِس کی عورت تو گاؤں میں ہے۔ تین دن لگے گا اِدھر ممبئی آنے کو۔''گیٹ کے قریب پہنچ کر منڈل نے شفیقل سے تشویش ظاہر کی۔

''گھبراؤمت دادا، میری عورت تو یہیں ہے نا! اس کو فون کرتا ہوں۔''

''تیری عورت!''

''ہاں، پھر کیا کرے گا؟''

''لڑکا لوگ کو وہ کدھر یہاں اسپتال میں لائے گی!''

''چھوٹا بچہ لوگ کو باز و والوں کے گھر چھوڑ کر بڑے کے ساتھ نکل آئے گی، دادا!''

''وہ یہاں آکر کیا کرے گی؟ یہاں پہلے ہی پریشانی ہے۔''

'' 'میں روحیم کی عورت ہوں'، بول کر وہ یہ کام کردے گی۔''

''تو اپنی عورت کو روحیم کی عورت بتائے گا، شوفیقل!!''، منڈل نے تکلیف کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔ ورنہ لمبے ٹائم تک باڈی کے لئے لٹکے رہیں گے۔''

''پولس کو معلوم نہیں پڑیگا، دادا؟''

''کیسے معلوم پڑے گا؟ انگوٹھا ہی لگانا ہے نا!''

صبح دس بجے شفیقل کی بیوی سائن اسپتال کے پولس سٹیشن پہنچی۔ اس وقت انسپکٹر پاٹل بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ایک حوالدار دوسری میز پر پڑی ہوئی فائلیں ٹٹول رہا تھا۔

''یہ کس کو پکڑ کر لایا ہے؟... تیرا عورت ہے کہ تیرا؟...''

انسپکٹر منڈل اور شفیقل ایسے دکھائی دئے جیسے اُن پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔

''باڈی کا عورت تو گاؤں میں ہے۔ دو دن کا راستہ ہے۔ ہے نا؟''، انسپکٹر پاٹل مسکرا کر شفیقل کی بیوی کو گھورتے ہوئے بولا۔ وہ اسے شوخ ہرے رنگ کی لنگی، جبہ پہنے ہوئے ممبئی نگری میں کسی روایتی لباس کے مقابلے میں حصہ لینے جارہی خاتون سی لگی۔

''صاحب ایڈجسٹ کر لیجئے۔''، شفیقل کی بیوی نے اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت کی اور ہاتھ جوڑ کر بولی، ''کرپا کریئے صاحب!''

''اے حوالدار، ایسا کر۔ یہ بائی کو اندر ڈال رے۔''، انسپکٹر پاٹل چائے کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

تینوں چپ چاپ وہاں سے نکل آئے۔

''صاحب کو کیسے معلوم ہوا کہ بودی (بھابی)، روحیم کا بی نہیں ہے؟''، باہر نکل کر منڈل نے حیرت سے شفیقل کا منہ دیکھا۔

''سادہ لباس میں گیٹ میں سی آئی ڈی گھومتا ہوئے گا، ہماری بات سن لیا ہوگا....ورنہ سائن کر کے لے جاتے!''، منڈل نے افسوس کے ساتھ کہااور تینوں ایس ٹی ڈی بوتھ کی جانب بڑھے۔

۔''سیٹھ، یہ لوگ روحیم کا باڈی نہیں دیتا ہے۔..''، منڈل نے ملک سیٹھ کوفون کیا۔

''کیا؟؟ روحیم مر گیا؟؟؟''

''آپ آؤ تو کچھ ہوئے گا۔اب بس آپ کا سہارا ہے۔ پلیز صاحب!''، منڈل کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ملک سیٹھ اپنے یہاں کام کرنے والوں کو پریوار کی طرح رکھتا تھا۔فوراً کار نکالی اور ممبئ پہنچ گئے۔

''اِس کی عورت آئے گی تو ہی باڈی ملے گی۔''، انسپکٹر نے ملک سیٹھ سے بھی وہی کہا،

''وہ کولکاتا میں ہے صاحب!''

''معلوم ہے۔کولکاتا میں ہے تو کیا؟...اب اس کی عورت کوفون کرو۔ پولس کے سامنے اس کو کھڑا کرو اور باڈی لے جاؤ۔''

''یہ لوگ بھی ان پڑھ ہیں اور مجھے بھی ضروری کام ہے۔زیادہ دیر رُک نہیں سکتا۔میں تو صرف ان کی مدد کے لئے آیا ہوں۔''

''تو کیا کرنے کا؟''

''اُسکی عورت کو کولکاتا سے ممبئ آنے کو تین دن تو لگے گا۔''

''تین دن لگے گا؟''، انپکٹر نے ملک سیٹھ کی اس کیس میں دلچسپی دیکھ لی تھی، نرم پڑ گیا۔ بولا، ''تو ایسا کرو، وہاں سے اس کی عورت کا فیکس منگوالو کہ 'میں بیمار ہوں اور میرے مرد کا باڈی میرے دیور کو دے دو۔' پولس اسٹیشن چٹھی دے گا، تبھی باڈی ریلیز ہوگا۔''

منڈل ایس ٹی ڈی بوتھ کی طرف دوڑا۔لوٹ کر بولا۔

''وہاں فیکس نہیں ہے، بولتے ہیں۔کولکاتہ سے پچاس کلو میٹر کی دوری پر

مرشدآباد شہر ہے صاب! وہاں سے بائیس سوکلومیٹر پر ہمارا گاؤں ہے۔ کوئی مرشد آباد جانے والانہیں ہے۔ کوئی فیکس کرنے والانہیں ہے۔''

ملک سیٹھ نے انسپکٹر کے آگے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ یکلخت اسے یاد آیا کہ اس کی چھوٹی سالی کے بیٹے نہال کی کولکاتہ میں کسی کمپنی والے سے پہچان ہے۔ اس نے نہال کوفون لگایااور نہال کو اسے فیکس کرنے کو کہنے کے لئے کہا۔ ملک سیٹھ کے بھیجے ہوئے فیکس کوکولکاتہ سے پلٹ کرآنا تھا۔

دو گھنٹے انتظار میں گزر گئے مگر کلکتہ سے فیکس نہیں آیا۔ ملک سیٹھ نے نہال کودوبارہ فون کیا۔ نہال نے بتایا،

''میں نے دوبار کمپنی والے کے موبائل پرفون کیا تھا۔ کہا کہ بس ابھی فیکس کرنے جارہاہوں۔ میٹنگ میں ہوں۔ یار!تھوڑاٹائم لگے گا...،اوراس کے بعدوہ ناٹ رِیچیبل ہوگیا۔''

''یعنی بالکل غائب!''

''جی...چھوڑئے انکل، میں اپنے دوسرے پہچان والے سے بات کرتا ہوں۔''، ناامید ہوکرنہال نے کلکتہ کے اپنے ایک دوسرے کلائنٹ کوفون لگایا۔ اور گھنٹے بھر کے اندر ملک کواسکے علاقے کے ٹیلیفون بوتھ پرفیکس مل گیا۔

''فیکس کلیئر نہیں آیا ہے۔ دوبارہ کرو''، فیکس صاف نہیں تھا، کافی دھندلا تھا۔ انسپکٹر پاٹل اسے لینے کو تیارنہیں تھا۔ ملک سیٹھ نے نہال سے اسکے اسی کلائنٹ کوکہلوایا کہ دوبارہ فیکس کرے۔ لگ بھگ پونا گھنٹہ سیٹھ بوتھ پر کھڑے رہے۔ تھک ہارکرانسپکٹر کی یادآئی۔

ملک سیٹھ پولس سٹیشن پہنچتے ہی انسپکٹر پاٹل کے پیچھے لگ گیااور بڑے معنی خیزانداز میں کہا۔

''انسپکٹرصاحب! ہمارے لئے تو مشکل ہے۔ بس آپ ہی کچھ کرسکتے ہیں۔''

''لاش کاعورت منگتا ہے نہیں تو...اسکا فیکس...ایسا قانونی طریقہ ہے۔اور دوسرا

کوئی طریقہ نہیں ہے''، انسپکٹر بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''کیا صاب!''

''ایک عورت نے کیس کیا تھا۔ اسکے آدمی کا باپ اس کے مرد کا باڈی لے کر گیا تھا اور جلا بھی دیا تھا''، ساتھ بیٹھا انسپکٹر انگولے ہنسا، بولا،

''ہمارا کھٹیا کھڑا کر دیا تھا یار، سالی نے!''

''اس کا باپ بڈھا ہے۔''، ملک نے رحیم کے کیس کو الگ بتلاتے ہوئے سمجھایا۔''وہ بنگالی میں بات کرتے ہیں۔ اور کوئی دوسری بھاشا انہیں سمجھ میں نہیں آتی۔ منڈل نے ڈکٹیٹ کروایا تھا، مگر لکھ کر فیکس نہیں کروا پا رہے ہیں۔ صبح سے شام ہوگئی صاحب!''

''تو ہاتھ سے لکھ کر فیکس کرو، لاش کا عورت کو بولو، کہ وہاں سے اسی کو فیکس کریں۔ سمپل!''

''صاحب!!''

''اب فیکس 'کلئیر' تو آنا منگتا ہے نا!''، انسپکٹر پاٹل نے ان کی بات جیسے ان سُنی کی۔

''صاحب! کچھ کیجئے۔ شام ہوگئی ہے، چھے بج رہا ہے۔''، سیٹھ ایس ٹی ڈی بوتھ کے لئے جانے کے لئے مُڑنے لگے تھے۔

''آپ ذمہ داری لیتے ہیں کیا؟...انڈرٹیکنگ دیتے ہیں کیا؟''

''نہیں انسپکٹر صاحب۔''، ملک سیٹھ نے تھکن بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، کل اس کی عورت لفڑا کرے گی تو؟؟...اس کے بھائی سے لکھوالو نا!''

''نہیں چلے گا۔''

''ایسا فیکس منگواتے ہیں؟....یہ دیکھو یہ تمل ناڈو کا ہے۔ ایفیڈیوٹ کرا کے پولس سٹیشن کا ٹھپا لگا کے فیکس کیا ہے...ایسا ہونا منگتا ہے۔''، انسپکٹر پاٹل نے کسی اور کی عرضی نکال کر دکھائی،''اور یہ تمہارا فیکس! نہ نیچے سٹیمپ، نہ کچھ! پولس سٹیشن نہیں تو کم سے کم

گاؤں کے سرپنچ کا سکّہ تو ہونا منگتا ہے نا کہ، عورت کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔فیکس میں کم سے کم پتہ، فون نمبر آنا منگتا ہے۔''

''صاحب چائے پانی...؟''

''ایسا نئیں بولنے کا رہتا ہے! یہ پولس چوکی ہے!...''، انسپکٹر چونکنے کی اداکاری کرنے لگا۔''ادھر میں اس کو لاچ بولتا ہے!... پولس کو رشوت دینے کا نئیں۔سیدھا اندر کر دے گا''، پھر وہ ذرا سا ہنسا اور اسکی توند ہلی۔''ارے بھاؤ! تم کو کیا لگتا ہے ہم غریب لوگ کو ستانے کو یہ نیم بناتا ہے؟ یہ قانون ہے، قانون!....اب فیکس تو کلئیر آنا منگتا ہے نا!...تبھی تو باڈی دے سکے گا نا!''

''وہ ابھی ہو جائیگا۔بس دس منٹ دیجئیے۔''، ملک سیٹھ اُس کے بات سمجھنے کے اشارے سے خوش ہو کر بولا۔

''تو ایسا بولنے کا نا!''، ملک سیٹھ کو لگا جیسے انسپکٹر نے بھی مطمئن ہو کر انھیں تسلی دی ہو۔ورنہ پھٹیچر سے دکھائی دینے والے منڈل بھائیوں سے اُسے بھلا کیا امید ہو سکتی تھی!

چوکی سے باہر آ کر ملک سیٹھ نے اپنے ہاتھ سے دوسری عرضی لکھی۔اس پر منڈل کا انگوٹھا لگایا اور کسی دوسرے ایس ٹی ڈی بوتھ سے اسے پولس سٹیشن کے پاس والے اُس بوتھ پر فیکس کرنے کے لئے کہا، جہاں وہ کھڑے تھے۔ اب فیکس صاف آیا تھا۔

انسپکٹر پاٹل نے فیکس کے کاغذ کے بائیں کنارے سے ممبئی کا فون نمبر، جو مقامی پی سی او کا تھا، پھاڑ کر کاغذ کے اُس ٹکڑے کو اپنے ٹیبل کے نیچے رکھے کوڑے دان میں پھینک دیا۔اور کولکاتا کے دھندلے فیکس کے ساتھ اسے سٹیپلر سے جوڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

سائن اسپتال کے پچھلے حصّے میں مردہ خانہ تھا۔ملک سیٹھ منڈل کے ساتھ وہاں گئے۔ساری لاشیں ننگی پڑی ہوئی تھیں۔ایک پر ایک ڈالی ہوئی۔ناک پر رومال رکھے ہوئے ملک کو ابکائی آ گئی۔تیس لاشوں میں سے رحیم کی لاش کی شناخت کر کے نکلے۔باہر ایک چھوٹے سے بچّے کی ڈیڑھ فٹ کی لاش ایمبولینس میں ڈال کر اس کے گھر لے جایا جا رہا

تھا۔ انکا دل اور بھی بھر آیا۔

''پی ایس آئی میں تیرا نام سُمن لکھا ہے۔ تو سلیمان ہوئے گا۔ سُمن کیسے ہو سکتا ہے؟ پولس سٹیشن جا کر اپنا نام ٹھیک کروا کر لا۔''، مردہ گھر کے آفس کے کلرک نے اعتراض کیا۔

''ارے یہی تو ہے سمن منڈل۔''، حوالدار وہاں آ پہنچا تھا۔

''یہ تو عورت کا نام ہے!''، کلرک اڑ گیا۔

''ہے تو کیا کرے گا؟ پاٹل صاب کا آرڈر ہے... باڈی اِس کو دے دے۔''، حوالدار نے دھمکانے والے لہجے میں اسے حکم دیا۔

رحیم سائن اسپتال میں علاج ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔ اسی لئے اس کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ اور اسے لئے ملک سیٹھ کو اس کی لاش حاصل کرنے میں پسینے چھوٹ گئے۔

''گاڑی بھیج دیجئے۔''، لاش کے پیپر حاصل کر کے ملک سیٹھ نے انڈرٹیکر مائکل پنٹو کو فون کیا۔

''کیا بزنس ہے نا لاش پیک کرنے کا!''، سیٹھ کے بڑبڑانے پر منڈل نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔

''صاحب! ہم کو بھی پلین سے گاؤں بھیجو صاب!....نہیں تو ہمارے پہنچنے تک وہ لوگ بھائی کو دفنا دے گا''

''تو جا یار! ٹرین سے! اب تجھے بھیجنے پر ایک اور آٹھ ہزار ڈالنا پڑے گا...ایک تو دو ہزار روپے پاٹل کو بھی دینے پڑے ہیں۔''

''کیوں صاب؟''

''تب ہی تو باڈی ملی ہے....تم کیا سمجھے تھے!''

منڈل کی حیرت بھری آنکھوں کی جانب دیکھنے کی فرصت کِسے تھی! سب کالی کانچ والی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے، جو رحیم کی لاش کو اسپتال سے انڈرٹیکر، پیکر کے یہاں لے جا رہی تھی۔

☆☆

KHALISH BE NAAM SI

(short stories)

by

Sadiqua Nawab Saher

صادقہ نواب سحر اکیسویں صدی کے آغاز سے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اُبھری ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' سے ان کو برِ صغیر و ہندو پاک میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ حال ہی میں ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'مکھوٹوں کے درمیان' شایع ہوا۔ اِس مجموعے کو بھی اردو حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

اپنے اس افسانوی مجموعہ 'خلش بے نام سی'' میں صادقہ نواب سحر نے ہندوستان کے سماجی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی اور کہیں کہیں نفسیاتی اور جنسی مسائل کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اِن کہانیوں کے کردار ہندوستانی جڑوں میں پیوست ہیں۔ ان کی زبان و بیان میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی معاشرت کو بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ جزئیات نگاری پر بھی مصنفہ کو پورا عبور حاصل ہے۔ زیادہ تر افسانے مختصر ہیں لیکن ان میں زندگی کی حرارت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مصنفہ نے اپنی کہانیوں میں عورت کی بے بسی، انا اور خودداری کو پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ انھوں نے انسان اور خصوصاً عورت کو پورے حوصلے، عزم اور آزادی کے ساتھ جینے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔

ڈاکٹر وسیم بیگم

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

www.ephbooks.com

₹ 150.00